راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

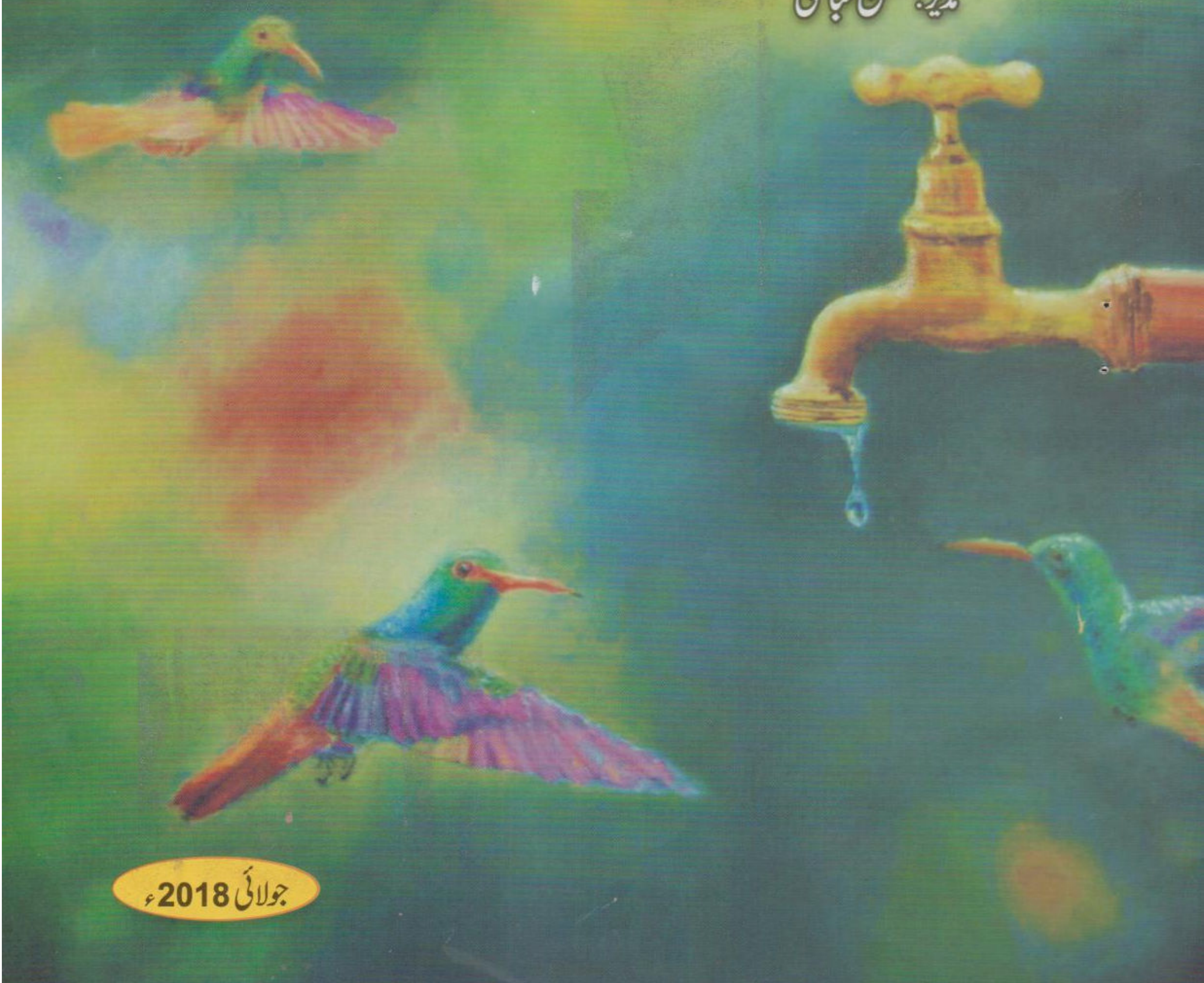

جولائی 2018ء

اردو دبئی کی قومی زبان کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے

متحدہ عرب امارات میں مقیم نامور شاعر ادیب اور سماجی کارکن امجد اقبال امجد سے عامر بن علی کی گفتگو

وطن سے دور وطن کی خوشبو کی مثال دیکھنی ہو تو وہ متحدہ عرب امارات ہے

پاکستان سے باہر تارکین وطن پاکستانیوں کی سب سے بڑی آبادی متحدہ عرب امارات میں مقیم ہے۔ یو اے ای میں مقیم پاکستانیوں کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق پندرہ لاکھ کے قریب ہے جو مقامی آبادی سے دوگنا سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اسی تناسب کے سبب یہ دیس منی پاکستان محسوس ہوتا ہے۔ اس احساس کا سبب فقط ہماری وہاں مقیم آبادی نہیں بلکہ پاکستان اور اردو زبان کے روابط ہیں۔ پاکستانی ثقافت اور اردو زبان و ادب کے متحدہ عرب امارات کے ساتھ یہ ثقافتی رشتے مضبوط بنانے کے لیے کوشاں نامور شخصیات میں سے ایک امجد اقبال امجد ہیں۔ وہ صاحب دیوان شاعر ہیں اور پاکستانی ایسوسی ایشن دوبئی لٹریری سوسائٹی کے صدر بھی ہیں۔ گزشتہ دنوں دوبئی جانے کا موقع ملا تو ان کی دعوت پر پاکستان سنٹر، اور لائبریری کا بھی دورہ کیا۔ گرینڈ حیات ہوٹل میں انہوں نے ایک شاندار شعری نشست کا میرے اعزاز میں اہتمام کیا۔ کچھ فراغت محسوس ہوئی تو میں نے ارژنگ کے قارئین کے لیے ان سے انٹرویو کی فرمائش کر دی۔ یہ رسمی گفتگو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

ارژنگ: ابتدائی زندگی سے بات کی ابتدا کرتے ہیں۔ پیدائش کہاں ہوئی؟ ابتدائی زندگی کیسے گزری؟

امجد اقبال امجد: میری پیدائش کھاریاں کے نواح میں واقع ایک گاؤں سدھ میں ہوئی اور وہاں ہی میری ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہ گاؤں میجر عزیز بھٹی شہید نشان حیدر کے گاؤں کے بالکل پاس ہی ہے۔ میرے والد صاحب نے گاؤں میں ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ وہ ذہنی طور پر جماعت اسلامی سے نظریاتی وابستگی رکھتے تھے۔ میری عمر ابھی بہت چھوٹی تھی جب انہوں نے مجھے اس لائبریری کا انچارج بنا دیا۔ جو بھی آدمی لائبریری سے کتاب لے کر جاتا اس کے نام کا اندراج، جو کتاب واپس کرتا اس کا اندراج میں کرتا، اگر کوئی پندرہ دن سے زیادہ کتاب واپس نہ کرتا تو پھر اس سے میں دو روپیہ جرمانہ وصول کرتا تھا۔ میرے خیال میں یہیں سے میری کتابوں اور حرفوں سے دوستی شروع ہوئی تھی۔

ارژنگ: لکھنے کی ابتدا کیسے ہوئی؟

امجد اقبال امجد: جیسا کہ میں نے عرض کیا طبیعت میں موزونیت تو شروع سے ہی تھی اور پڑھنے لکھنے کا ماحول بھی

(بقیہ اندرونی صفحات پر)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 19 جولائی 2018 شمارہ نمبر 3

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{ مجلس ادارت }

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ لبنیٰ صفدر

{ مجلس مشاورت }

◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین) ◉ نازاو کاڑوی

کمپوزنگ ● زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ● نعمان حسن : 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت / ، ۲

مضامین:

○ ماڈرن شیر اور قدامت پسند لومڑی / عطاء الحق قاسمی ، ۴

○ اردو کے پھیلتے عالمی دائرے / ڈاکٹر مختار عزمی ، ۶

○ ایوب ندیم......شاعری اور درویشی ایک ساتھ/ نیلما ناہید درانی ، ۸

○ طویل نظم "نوحہ گر" پر ایک تنقیدی نظر / دانیال طریر ، ۹

○ مبشر سعید......محبت کا شاعر / احمد شہریار ، ۱۲

○ سچائی کے خدوخال / حمیرا راحت ، ۱۴

○ حاصل راہ (تقریظ) / قاضی دانش صدیقی ، ۱۵

○ نئی نسل کا نمائندہ شاعر......حسن عباسی/ ریاض ندیم نیازی ، ۱۸

○ پس گماں کا شاعر......احمد سبحانی آکاش/ لبنیٰ صفدر ، ۱۹

شعری گوشے:

○ بسمل صابری، ڈاکٹر صغرا صدف، ڈاکٹر رابعہ سرفراز، راشد علی شاہ، سعدیہ سیٹھی ۲۰ تا ۲۴

افسانے

○ مجھے رنگ دے / عطاء اللہ عطاء ، ۲۵

○ ننھے ہاتھ / ایوب صابر ، ۲۷

سفرنامہ

○ روڈ ٹو کا فرستان / ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ، ۳۰

○ ارجنٹائن-خوابوں جیسی سرزمین / عامر بن علی ، ۳۳

○ بقیہ انٹرویو: امجد اقبال امجد ، ۳۶

○ بقیہ انٹرویو: تبسم انوار ، ۳۸

○ شاعری ، ۴۰

مختصر ادبی خبریں ، ۴۳

تبصرہ کتب ، ۴۵

نامہ ہائے احباب ، ۴۸

+++++

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد

سب نے دیکھا مکان صاحب کا
میں نے دیکھا جہان صاحب کا
میں تو اپنا اسے سمجھتا تھا
اشک ہے ترجمان صاحب کا
آج لنگر کے پیسے جیب میں ہیں
آج ہوں میزبان صاحب کا
وہ ہی دل کو پسند آتا ہے
جو بھی کھلتا ہے تھان صاحب کا
پاس ہوں گے سفارشی اس میں
ہے کڑا امتحان صاحب کا
چاند ہے یا فلک کے ماتھے پر
پڑ گیا ہے نشان صاحب کا
کرنے پڑتے ہیں کام لوگوں کے
رکھنا پڑتا ہے دھیان صاحب کا
زیست کڑوی اُسے نہیں لگتی ہے
جس کے منہ میں ہو پان صاحب کا

حسن عباسی/لاہور

حمد

جہانِ رنگ میں پھیلے ترے نظارے ہیں
ہر ایک سمت ترے ہونے کے اشارے ہیں
کسی جگہ ہو زمیں پر کوئی عبادت گاہ
ہر ایک صبح بجے بس ترے نقارے ہیں
جہان سارا مہکتا ہے جن کے ہونے سے
یہ رنگ و بو ہو کہ خوشبو، ترے اُتارے ہیں
رکھا ہے چاک پہ اور پھر کھنکتی مٹی سے
ارژنگ

عجیب طرح کے نقش و نگار اُبھارے ہیں
یہ تیرے نور کا ادنیٰ سا ایک مظہر ہے
کثافتوں سے بھرے جسم بھی نکھارے ہیں
یہ چاند تارے، یہ سورج، بدلتے موسم بھی
ترے وجود کے ہر سمت استعارے ہیں
کسی بھی سمت روانہ ہوں، کوئی منزل ہو
ہمیں اُسی کے تو اخلاق جی سہارے ہیں

ڈاکٹر اخلاق گیلانی/لاہور

نعت

زباں کو وصفِ درود و سلام چاہیے ہے
نظر کو روضۂ خیر الانامؐ چاہیے ہے
اسی میں راز ہے پنہاں مری فضیلت کا
مجھے غلاموں میں ادنیٰ مقام چاہیے ہے
کچھ اس لیے بھی مدینے کی رہ گزر میں ہوں
کہ مجھ کو لذتِ کیف دوام چاہیے ہے
یہ بارگاہِ رسالتؐ ہے ہر قدم پہ یہاں
نگاہِ شوق بڑا احترام چاہیے ہے
وہ جس دیار میں مسکن ہے میرے آقاؐ کا
تمام عمر وہیں پر قیام چاہیے ہے
خدائے لوح و قلم مدحتِ نبیؐ کے لیے
سخن کے باب میں کچھ اہتمام چاہیے ہے
اُنھی کے کوچے میں کٹ جائے زندگی کہ مجھے
فضائے شہرِ مدینہ مدام چاہیے ہے
نہ چاہیے مجھے دنیا میں مرتبہ کچھ بھی
جو چاہیے تو غلاموں میں نام چاہیے ہے
عجیب کیف عبادت ہے اُنؐ کے روضے پر
اُسی فضا میں سجود و قیام چاہیے ہے
یہاں بھی اُنؐ ہی سے منسوب میں رہا ہوں رضا
اسی حوالے سے محشر میں نام چاہیے ہے

علی رضا/ساہیوال

افلاک سے بھی ارفع مدینے کی زمیں ہے
کیا اس کے مقابل بھلا فردوسِ بریں ہے
قربان ہیں جس ذاتِ گرامی پہ دو عالم
وہ کون زمانے میں سوا اس کے حسیں ہے
وہ قطرۂ شبنم ہو کہ ہو رہ صحرا
چھو لے ترے نعلین کو وہ دُرِّ ثمیں ہے
پہنچا ہو جو اک پل میں سرِ عرشِ معلیٰ
مرسل کوئی ایسا تو زمانے میں نہیں ہے
اے صاحبِ قرآن! عنایت کی نظر ہو
تیرے لیے بے چین مرا قلبِ حزیں ہے
اس قلب کی عظمت کا بیاں کیسے ہو ممکن
وہ جس میں بسا گنبدِ خضریٰ کا مکیں ہے
جس دل کو بھی مل جائے ترے در کی دولت
اس کے لیے پھر فتح مبیں فتح مبیں ہے
اس در کا تفاخر کو بھی دیدار ہوا ہے
جس در پہ جھکی رہتی ملائک کی جبیں ہے

تفاخر محمود گوندل/گجرات

تیرے در سے جو ہٹ گئے آقاؐ
بخت ان کے اُلٹ گئے آقاؐ
ہاتھ خالی جو آئے در پہ ترے
جھولیاں بھر پلٹ گئے آقاؐ
لفظ سارے تمہاری مدحت میں
عاجزی سے سمٹ گئے آقاؐ
ذرے وہ عرش سے بھی افضل ہیں
آپؐ سے جو لپٹ گئے آقاؐ
دن وہ سرمایۂ حیات ہیں جو
تیری یادوں میں کٹ گئے آقاؐ
تیرے در کے گدا مقابل غم
عزم و ہمت سے ڈٹ گئے آقاؐ
غم کے بادل جو چھائے تھے دل پر
تو نے دیکھا تو چھٹ گئے آقاؐ
تیرے عمرانؔ کے، ترے صدقے
درد سارے سمٹ گئے آقاؐ

عمران مفتی/لاہور

آپؐ کے در سے لو لگی جب سے
بن گئی میری زندگی تب سے

آپؐ کے در پہ آ جھکوں آقاؐ
یہ طلب تھی طلب بھی تھی کب سے
آپؐ کا نام جب سنا میں نے
آہ سی اک نکل گئی لب سے
کوئی ان کو گھٹا نہیں سکتا
عظمتیں آپ کو ملیں رب سے
آپؐ کی نعت ہی لکھوں ہر دم
ہے فقط ایک ہی دعا رب سے
یوں تو اعلیٰ ہیں سب نبیؐ لیکن
آپ ہیں ارفع و رفیع سب سے
مستحق ہیں سزا کے سب کافر
تیرا گستاخ ہے لعیں سب سے
تیرا عمرانؔ تیری رحمت کا
منتظر ہے مرے نبیؐ کب سے

عمران مفتی/لاہور

مجھ پر کرم کیا ہے رسالتؐ مآب نے
بن مانگے دے دیا ہے رسالتؐ مآب نے

دشمن سے کی وفا ہے رسالتؐ مآب نے
رحمت کی دی جزا ہے رسالتؐ مآب نے
جیسا گناہ گار بھی قدموں میں آ گرا
سینے لگا لیا ہے رسالتؐ مآب نے
آئی بہار دین میں جب آ گئے عمرؓ
جس وقت کی دعا ہے رسالتؐ مآب نے
دیکھو! کہ بے سہارے کو طیبہ بلا لیا
اس طرح کی عطا ہے رسالتؐ مآب نے
خالی کسی غلام کا دامن نہیں رہا
رحمت سے یوں بھرا ہے رسالت مآب نے
تارا ہے وہ زمانے کی آنکھوں کا دوستو
جس جس کو بھی چنا ہے رسالت مآب نے
لطف و کرم کی بارشیں ساجدؔ پہ ہو گئیں
جب حال دل سنا ہے رسالت مآب نے

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمراء j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

ماڈرن شیر اور قدامت پسند لومڑی

عطاء الحق قاسمی

آج آپ کو ایک کہانی کیوں نہ سنائی جائے؟

یہ ایک شیر اور لومڑی کی کہانی ہے۔ ظاہر ہے شیر بہت طاقتور تھا اور لومڑی اس کے مقابلے میں بہت کمزور، مگر چالاکی میں، پورے جنگل میں اس کا ثانی کوئی نہیں تھا، ایک دفعہ شیر اور لومڑی میں کسی بات پر ٹھن گئی، لومڑی کے دل میں گرہ بیٹھ گئی اس نے شیر کو بے دست و پا بنانے کا ارادہ کرلیا:

لومڑی نے جنگل میں ایک بیوٹی پارلر کھول لیا اور جنگل کے بادشاہ سے استدعا کی کہ وہ اس کا افتتاح کرے، جنگل کا بادشاہ یعنی شیر یہ سن کر ہنسا اور اس نے کہا ''بناؤ سنگھار کے کاموں سے میرا کیا تعلق، یہ کام تم کسی اور سے کراؤ'' لومڑی بولی ''عالی جاہ! میں آپ کی ریپوٹیشن بہتر بنانا چاہتی ہوں، آپ کے متعلق آپ کے دشمن روزانہ نت نئی افواہیں پھیلاتے ہیں، آپ کو تنگ نظر مشہور کیا جارہا ہے، قدامت پسند کہا جاتا ہے اور آپ کو روشن خیالی کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، آپ بیوٹی پارلر کا افتتاح کریں گے تو آپ کے متعلق یہ افواہیں خود بخود دم توڑ جائیں گی'' شیر نے ایک لمحہ اس کی بات پر غور کیا اور پھر افتتاح کی حامی بھرلی۔

شیر نے بیوٹی پارلر کا فیتہ کاٹا، ریچھ، گیدڑ، لگڑ بگڑ اور دوسرے جانوروں نے بھرپور تالیاں بجائیں، اسٹیج سیکرٹری بندر تھا، اس نے پہلے تو اچھل اچھل کر داد دی پھر مائیک پر آکر کہا ''شہنشاہ دوراں: آج آپ نے اس محفل میں تشریف لاکر ثابت کردیا ہے کہ آپ ایک روشن خیال حکمران ہیں، بناؤ سنگھار کی سرپرستی سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ آپ احساسِ جمال سے بہرہ ور ہیں، آپ خوبصورتی اور حسن کو پسند کرتے ہیں یوں آپ کی ذات کے حوالے سے کیا جانے والا ایک طرفہ پراپیگنڈہ زائل ہوگیا ہے۔'' شیر کو یہ ساری باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں مگر اس نے حاضرین کو تالیاں بجاتے دیکھا تو ان باتوں سے اس کی اجنبیت کم ہونے لگی۔ تقریب کے بعد لومڑی لہنگا پہن کر اسٹیج پر آئی، اس نے سات بار جھک کر شہنشاہ سلامت کو سلام کیا اور کہا ''یہ باندی آپ کی آمد کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ اب آپ کی آمد کی خوشی میں مجرا پیش کرتی ہوں'' پھر اس نے جی بھر کر مجرا کیا، شیر پہلے تو حیرت سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر اسے لطف آنے لگا چنانچہ رقص وسرود کی یہ محفل ساری رات جاری رہی!

صبح لومڑی جنگل کے دوسرے جانوروں کے پاس گئی اور کہا ''شیر کی چیرہ دستیوں میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، اب تو وہ مجھ ایسی شریف زادیوں سے زبردستی مجرا بھی کرواتا ہے، پہلے اس کے ہاتھوں جان محفوظ نہیں تھی، اب کسی کی عزت بھی محفوظ نہیں رہی'' اس طرح کی دو تین ملاقاتوں کے نتیجے میں وہ شیر کے خلاف جنگل کے جانوروں کا ایک اتحاد تشکیل دینے میں کامیاب ہوگئی، اس اتحاد میں چیتا، بھیڑیا اور سانپ کے علاوہ خود شیر کا اپنا ایک بھائی بھی شریک تھا، اسے کہا گیا تھا کہ اگر اتحاد کامیاب ہوگیا تو تمہیں خوراک کے سلسلے میں کوئی تردد نہیں کرنا پڑے گا، تمہارا دسترخوان انواع واقسام کے کھانوں سے بھر دیا جائے گا!

ایک دن لومڑی شیر کے پاس گئی اور کہنے لگی ''ظل الٰہی، جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟''

ظل الٰہی اس وقت ایک ہرن نوش جاں فرمانے کے بعد اونگھ رہے تھے، غنودگی کے عالم میں بولے ''کہو'' لومڑی نے دست بستہ عرض کی ''شہنشاہ دوراں آپ کی روشن خیالی کی دھوم تو پورے جنگل میں ہے لیکن چیتے، ریچھ اور سانپ نے آپ کے خلاف ایک کولیشن تشکیل دی ہے، آپ جانتے ہیں یہ بہت ظالم جانور ہیں۔ ان سب سے بیک وقت ٹکرانا مصلحت کے خلاف ہے، میرے پاس ایک تجویز ہے جس پر عمل کرنے سے ان کے غبارے سے ہوا نکالی جاسکتی ہے'' شیر نے غصے میں دھاڑتے ہوئے کہا ''تجویز پیش کی جائے'' لومڑی بولی ''بادشاہ سلامت، آپ کے خلاف سارا پروپیگنڈہ آپ کے پنجوں اور آپ کے جبڑے کی وجہ سے ہے'' اس پر شیر نے غصے سے لومڑی کو دیکھا اور دھاڑتے ہوئے کہا ''تو کیا میں یہ نکلوا دوں'' لومڑی بولی ''خدا نہ کرے ایسا ہو لیکن اگر آپ صرف پنجوں کے ناخن کٹوا دیں اور سامنے والے دانت نکلوا دیں تو آپ کی طاقت بھی بحال رہے گی اور دشمن کا پراپیگنڈہ بھی خاک میں مل جائے گا'' شیر کو ڈر تھا کہ کہیں چیتے اور بھگیاڑ مل کر اس کی بادشاہت کا خاتمہ نہ کردیں، اس نے بادل نخواستہ لومڑی کی یہ تجویز منظور کرلی!

اگلے روز شیر شکار کے لیے اپنے کچھار سے نکل کر ایک ہرن پر جھپٹا، اس نے دوڑ لگادی، کئی کلومیٹر دوڑنے کے بعد شیر نے اسے قابو کرلیا لیکن جب اس کے جسم میں اپنے پنجے گاڑنا چاہے تو ناخن نہ ہونے کی وجہ سے یہ پنجہ پھسل گیا اور اپنے دانت ہرن کی گردن میں گاڑنے کی کوشش کی تو یہ کوشش بھی ناکام رہی اس

جدوجہد کے دوران ہرن اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد شیر نے کئی دوسرے جانوروں پر قسمت آزمائی کی لیکن کوئی بھی اس کے قابو نہ آیا، شام تک بھوک کے مارے اس کا برا حال ہوگیا اور بالآخر وہ نڈھال ہوکر گر گیا!

اس کی آنکھیں اس وقت خوشی سے چمک اٹھیں جب اس نے رات کو لومڑی کو اپنی کچھار میں آتے دیکھا، لومڑی اسے دیکھ کر نہ کورنش بجالائی، نہ اسے ظل الٰہی یا شہنشاہ دوراں کہا بلکہ ایک فاصلہ سے اسے مخاطب کیا اور طنز یہ انداز میں کہا ''بھوک تو بہت لگی ہوگی!'' شیر نے نقاہت سے کہا ''ہاں، بہت زیادہ !تم میرے لیے کھانے کا بندوبست کرو، میں نے تمہارے مشورے پر اپنے ناخن کٹوائے اور اگلے دو دانت نکلوائے ،اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ میرے لیے دو وقت کے گوشت کا بندوبست کرو!'' لومڑی نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور کہا ''اے بیوقوف چوپائے ،کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا .... ہاں تمہارے ساتھ چونکہ ایک تعلق بن گیا ہے، میں تمہارے لیے گوشت تو نہیں گھاس کا انتظام کرسکتی ہوں''

یہ سن کر شیر کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے جھپٹا مگر لومڑی جو پہلے سے چوکس تھی اور شیر جو ایک دن کے فاقے سے نڈھال تھا، اسے پکڑنے میں ناکام رہا۔

تیسرے دن لومڑی پھر اس کے پاس آئی شیر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا اس نے لومڑی کو دیکھا تو کہا ''مجھے گھاس کھانا منظور ہے، خدا کے لیے کہیں سے میرے لیے گھاس کا انتظام کرو، میں تو چل پھر کر اب گھاس بھی تلاش کرنے کے قابل نہیں رہا'' لومڑی نے اس کی بے بسی دیکھی تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔اس نے کہا ''گھاس بھی تمہیں اس شرط پر مل سکتی ہے کہ تم اپنے منہ سے میاؤں کی آواز نکال کر دکھاؤ'' یہ سن کر شیر کا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے لیکن جسے اپنے وقار سے زیادہ اپنی جان عزیز ہو اس کی اس طرح کی خواہش پوری نہیں ہوا کرتی، چنانچہ شیر نے اپنا جی کڑا کر کے منہ سے میاؤں کی آواز نکالی اور پھر رحم طلب نظروں سے لومڑی کو دیکھنے لگا!

لومڑی نے اسے حقارت سے دیکھا اور کہا ''یہ میاؤں کی آواز تم نے صحیح نہیں نکالی ، کچھ دن ریاضت کرو، جب تم میاؤں کی آواز بالکل صحیح نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اس دن سے تمہیں باقاعدگی سے گھاس ملنا شروع ہوجائے گی''

آخری اطلاعات آنے تک یہ شیر ان دنوں منہ سے میاؤں کی آواز نکالنے کی ریاضت میں مشغول ہے اور اسے اس میں کافی دسترس حاصل ہوتی جارہی ہے!

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

اُردو کے پھیلتے عالمی دائرے

ڈاکٹر مختار عزمی

قومی سطح پر اردو کی دکھ بھری داستان ہمیں رلاتی ہے تو غیروں کو ہنساتی ہے۔(۱) گزشتہ دنوں برطانیہ کے نامور ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز(۲) David Mathews پاکستان آئے تو تعجب کا اظہار کیا کہ ابھی تک اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان کیوں نہیں بنایا جاسکا۔ اس موقع پر ڈاکٹر طاش مرزا(۳) نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''یوم آزادی کے موقع پر تاشقند کے پاکستانی سفارتخانے میں نہ صرف سفیر محترم نے انگریزی میں اظہار خیال کیا بلکہ صدر پاکستان اور وزیراعظم کے پیغامات بھی انگریزی میں لکھے اور پڑھے گئے۔''

صد افسوس جسے ہم ''قومی زبان'' کہتے نہیں تھکتے جب اسے سرکاری سطح پر نافذ کرنے کا وقت اور مطالبہ آتا ہے تو منافقت کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کی ایک ایک شق پر کئی کئی دن تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ اسی متفقہ آئین کی دفعہ 251 میں واضح طور پر لکھا ہے کہ 1988ء تک اردو سرکاری طور پر نافذ کردی جائے گی......تو پھر کون ہے جس نے حکومتوں کا ہاتھ روک رکھا ہے؟ 1988ء کے بعد تقریباً پانچ مرکزی حکومتیں اردو میں عوام سے ووٹ مانگ کر برسرِ اقتدار آئیں اور بے وفائی سے اردو کو پس پشت ڈالتی چلی گئیں۔ ایک اور پی پی پی کی حکومت کے جاتے ہی عبوری حکومت نے 2012ء میں کیا کہ جب مقتدرہ قومی زبان کا دائرہ کار محدود کرکے اسے ''ادارہ فروغ قومی زبان'' میں بدل دیا گیا۔

اس بند گھر میں کیا کہوں کیسا طلسم ہے
کھولے تھے جتنے قفل، وہ ہونٹوں پہ پڑ گئے

اس کے علی الرغم صورتحال یہ ہے کہ اردو اپنی قوت نمو اور عوام و خواص میں پذیرائی کی بدولت دنیا کی دوسری بڑی زبان بن چکی ہے۔(۳) اس کا ایک مظاہرہ مجھے اس وقت دیکھنے کو ملا جب جنوری 2015 میں چوتھی بار عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ الحمدللہ اس سے قبل 1999، 2004 اور 2009 میں بھی یہ سعادت مل چکی ہے مگر اس بار راقم نے اُردو کی پذیرائی اور پھیلاؤ کے کئی دلچسپ نظارے دیکھے اور حیران بھی ہوا۔ حرمین شریفین، عالمِ اسلام کے دو اہم عالمی مراکز ہیں، وہاں عربی کے بعد اُردو تیزی کے ساتھ رابطے کی زبان بنتی جارہی ہے۔ یہ وہ دائرہ ہے جو برصغیر سے باہر تشکیل پارہا ہے۔

اردو کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے سارے نظریہ ساز اس نکتے پر متفق ہیں کہ دو یا دو سے زیادہ گروہوں کے زیادہ سے زیادہ عرصہ تک ملاپ کے نتیجے میں کسی نئی زبان کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی ہوں یا ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی، سنیتی کمار چٹرجی ہوں یا عین الحق فرید کوٹی، گریرسن ہوں یا ڈاکٹر جمیل جالبی سب ہی اس معروضی حقیقت کو مانتے ہیں۔ چنانچہ اردو زبان کے حوالے سے بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے اہل عرب کا اہل سندھ سے ملاپ ہو یا اہل فارس کا اہل پنجاب سے۔ ہندی دکھنی سے ملی یا بنگالی انگریزی سے، شاہجہان آباد میں سپاہی پیشہ جمع ہوئے یا صوفیائے کرام کے آستانوں پر عوام و خواص کا اجتماع ہوا، نتیجتاً کم وبیش ایک ہزار برس کے سماجی عمل کے دوران اردو زبان کی تشکیل وتعمیر ہوتی چلی گئی۔ قیام پاکستان کے حوالے سے بھی اردو زبان کا تاریخی اور تابناک کردار فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

کروڑوں لوگ لمحہ موجود میں اردو زبان کے ارتقاء اور ترویج واشاعت میں ممد ومعاون ثابت ہو رہے ہیں۔ حکومتی سرپرستی کے بغیر پاکستان کے اندر اور باہر یہ سلسلہ تیزی سے جاری ہے۔ اب اردو کا وہ دائرہ مکمل ہوچکا ہے، جس کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا ہے۔(۳) اب وسیع تر دائرے تشکیل پارہے ہیں اور یہی ہمارا اصل موضوع ہے۔ یہ دائرے دنیا بھی میں پھیلتے ہوئے اردو کے عالمی مراکز پر مشتمل ہیں۔

پاکستان سے باہر جھانکیے تو بہت سے ممالک میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہوچکی ہیں۔ ٹوکیو سے ٹورانٹو تک، کاشغر سے کلکتہ تک اور بیجنگ سے مکہ مدینہ تک اردو کتابوں کی دکانیں، مدارس، اخبارات رسائل اور ٹی وی چینلز کام کررہے ہیں۔ جمیل الدین عالی نے تو اَسی (۸۰) کی دہائی میں کہہ دیا تھا۔

اتنی بار بلایا مجھ کو سننے مرا کلام
کہیں کراچی پڑ نہ جائے ٹورانٹو کا نام

''دعوت وتبلیغ'' کے نام سے اس وقت دنیا بھر میں جو محنت ہورہی ہے اس سے بھی اردو زبان کے دامن میں عالمی وسعت پیدا ہورہی ہے۔ جس طرح اس مبارک محنت کا ہدف مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہے، اس طرح اردو زبان کی وسعت اور اثر پذیری بھی نئی بلندیوں کو چھورہی ہے۔ چونکہ اس دینی محنت کا مرکز برصغیر میں بالخصوص پاکستان (رائیونڈ) میں ہے لہٰذا فطری طور پر پاکستان کی قومی زبان اردو اس محنت میں ایک بہت توانا کردار ادا کرہی

ہے۔اس حوالے سے نامور عالمی مبلغ مولانا طارق جمیل کی فصیح وبلیغ اردو خطابت کا بھی ایک اہم حصہ ہے۔ایسے خطیبان اردو کو ہر دور میں میسر رہے ہیں۔

ہر سال کم وبیش ایک سو سے زائد ممالک کی بڑی بڑی تبلیغی جماعتیں سالانہ اجتماع میں شرکت کے لئے (رائیونڈ) پاکستان میں آتی ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک سے کم وبیش 25 تا 30 لاکھ لوگ سالانہ اجتماع میں شرکت کرتے ہیں۔اب انتظامی وجوہ کی بنا پر سالانہ اجتماع کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشنری جذبے سے معمور یہ لاکھوں لوگ آپس میں ہر سال تقریباً ایک ماہ تک معاشرتی اور روحانی تعامل (Social and spirtual inetraction) کرتے ہیں اور اس سارے پراسس میں اردو رابطہ کی مرکزی زبان ہوتی ہے۔ اجتماع کے بعد ہزاروں جماعتیں نا صرف ملک کے اندر پھیل جاتی ہیں بلکہ ڈیڑھ سو ممالک کا رخ بھی کرتی ہیں۔اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اردو زبان دنیا بھر میں کن کن انجانے گوشوں تک پہنچ رہی ہے۔ ہزاروں جماعتیں دنیا بھر کی مساجد میں جاگزیں ہوتی ہیں۔ زبانی بیانات بھی ہوتے ہیں اور اہل محلّہ سے گراس روٹ لیول پر انٹرایکشن بھی ہوتا ہے۔دن رات میں دوبارہ فضائل اعمال کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ تعلیم اور یہ بیانات بالعموم اردو زبان میں ہوتے ہیں۔''فضائل اعمال'' میں مولانا محمد زکریاؒ نے قرآن کی عظمت، احادیث مبارکہ، صحابہ کرامؓ کے ایمان افروز واقعات کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اور اردو کے برمحل اشعار بھی استعمال کئے ہیں، لاکھوں لوگ روزانہ اس متن کو پڑھتے ہیں۔

تبلیغی جماعت ہمارے خصوصی شکریہ کی مستحق ہے کہ عالمی اور علاقائی زبانوں کی آمیزش کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے کلاسیکی حسن کو بھی قائم رکھے ہوئے ہے۔اب جبکہ اردو کے پروفیسر بھی انگریزی ہندسے استعمال کرتے ہیں، تبلیغی مرکز رائیونڈ کے تمام ستونوں کے نمبر اردو میں لکھے ہوئے ہیں۔ بات صرف ہندسوں کی نہیں بلکہ ٹیلی ویژن چینلز میں بھی انگریزی الفاظ کی بھرمار کے برعکس تبلیغی جماعت میں میٹنگ کی بجائے جوڑ یا اجتماع، کینٹین کی بجائے مطبخ کہا جاتا ہے۔اسی طرح چلہ، تشکیل، مشورہ اور دعوت جیسی اصطلاعات عام روانی سے بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔طوالت کے پیش نظر اسی پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ ورنہ یہاں ایک جہان آباد ہے جس میں اردو زبان کے بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں۔

دینی اور سیاسی جماعتوں کا ہمیشہ سے اردو زبان کے ساتھ خصوصی لگاؤ رہا ہے۔ جماعت اسلامی اور منہاج القرآن انٹرنیشنل کی طرف سے تیار کردہ اردو لٹریچر یا اس کا ترجمہ دنیا بھر میں پھیل رہا ہے سلیم احمد کے بقول

تیرے سانچے میں ڈھلتا جارہا ہوں
تجھے بھی کچھ بدلتا جا رہا ہوں

شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کی سائنٹیفک اپروچ، استقامت اور انقلابی وژن کے ساتھ ۸۰ سے زائد ممالک میں ''منہاج القرآن انٹرنیشنل'' کا نیٹ ورک مستعدی کے ساتھ مصروف کار ہے۔ پاکستان، کینیڈا، بھارت، ناروے، انگلینڈ اور بیسیووں مراکز میں اشاعت دین کا کام جاری ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں لانگ مارچ اور دھرنوں نے ایک نیا باب رقم کیا ہے۔اس موقع پر جہاں اردو زبان کا دامن شیخ الاسلام کی انقلابی اور آئینی تقاریر سے مالا مال ہوا ہے وہاں قومی اور بین الاقوامی سطح پر عوامی شعور بھی پیدا ہوا ہے اور بلاشبہ عالمی سطح پر اُردو زبان کے دامن میں بہت وسعت پیدا ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں بیسیوں ممالک کی طرف سے اردو تعلیم وتدریس کیلئے یونیورسٹی کی سطح پر انتظامات کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایران اور جاپان میں شعبہ ہائے اردو کم وبیش نصف صدی سے جاری ہیں۔ ترکی کی تین یونیورسٹی (استنبول، انقرہ اور قونیہ) میں، مصر کی جامعہ ازہر میں کئی دہائیوں سے ایم اے، پی ایچ ڈی تک اردو پڑھائی جاری ہے۔ چین کی بیجنگ یونیورسٹی میں شعبہ اردو خاصا فعال ہے۔ چین کے انتخاب عالم باقاعدہ شاعری کرتے ہیں، اسی طرح کیمبرج، آکسفورڈ، ٹورانٹو، میونخ، اور شکاگو میں شعبہ ہائے اردو، اردو مراکز، ادبی تنظیمیں اخبارات اور رسائل سرگرم عمل ہیں۔اگر پاکستان کے اندر کالے انگریزوں نے اردو کا راستہ روک رکھا ہے تو کیا ہوا اس میٹھی مستانی زبان کے دائرے دنیا بھر میں پھیل رہے ہیں۔(۵) (۲۰۰۵ء/۲۰۱۴ء)

حوالہ وحواشی:

۱- عالمی اردو کانفرنس اکتوبر ۲۰۱۳ء، لاہور

۲-سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز اور شعبہ جنوبی ایشیا لندن یونیورسٹی کے نامور محقق جنھیں حکومت پاکستان نے اُردو خدمات کے حوالے سے ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا ہے۔

۳-صدر شعبہ اُردو، تاشقند یونیورسٹی، روزنامہ خبریں لاہور پاکستان 25 اپریل 2015/ بحوالہ واشنگٹن پوسٹ، یو ایس اے۔

۴-جمیل جالبی، ڈاکٹر (1975) ''تاریخ ادب اردو''، لاہور مجلس ترقی ادب

۵-الحمدللہ عدالت عظمٰی پاکستان کے چیف جسٹس جو ادریس خواجہ نے ۸ ستمبر ۲۰۱۵ء کو اُردو کو بہ طور آئینی اور سرکاری زبان نافذ کرنے کے احکامات جاری کردیے ہیں۔

(۲۰۰۱ء)

ایوب ندیم......شاعری اور درویشی ایک ساتھ

نیلما ناہید درانی

کچھ عرصہ پہلے تک مجھے یہ گمان تھا کہ شاعر بنتے نہیں ، پیدا ہوتے ہیں ۔ شاعری موسموں کے سبھی رنگ لے کر شاعر کے ذہن پر اترتی ہے ۔ اس کی اندرونی کیفیات اور اس کے ارد گرد پھیلی دنیا میں ہونے والے واقعات جب لفظوں کا روپ دھارتے ہیں تو نظمیں اور غزلیں بن جاتے ہیں ۔لیکن گذشتہ چند سالوں سے شاعروں کو بنتے دیکھا ہے، جو خود رو پودوں کی طرح نمودار ہوتے ہیں ، کچھ پہلے اور کچھ پچاس برس کی عمر کے بعد، پھر وہ اپنی گروپ بندیوں اور اثر ورسوخ سے ،غرض ہر حربہ استعمال کرتے ہوئے ،دنوں میں شہرت کی تمام منزلیں طے کر جاتے ہیں ۔

ایسے شاعر حضرات اور خواتین آپ کو ہر جگہ اور ہر محفل میں دکھائی دیں گے ۔ ان کے برعکس جن کو شاعری ودیعت کی گئی ہوتی ہے ، وہ اس طرح کے ہتھکنڈوں سے بے نیاز اپنی تخلیقات میں مست اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں ۔ نہ ستائس کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ ایسا ہی ایک شاعر ایوب ندیم ہے، جو برسوں سے شاعری کر رہا ہے، لیکن اتنی بے نیازی اور کم آمیزی سے کہ اس میں درویشی کی صفات شامل ہوگئی ہیں ۔

ایوب ندیم صاحب کتاب تو ۱۹۹۸ء میں ہو گئے تھے ، جب ان کی شاعری کی پہلی کتاب ''چاند میرا ہم سفر'' شائع ہو کر منظر عام پر آئی تھی اور اہل سخن کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی ۔ اس کے بعد ان کی مکالموں اور بچوں کے لیے نظموں کی کتابیں بھی شائع ہوئیں ۔ اب بیس سال بعد ان کی غزلوں کی کتاب ''رات ڈھلتی نہیں'' منظر عام پر آئی ہے، جو اُن کی درویشی اور بے نیازی کا واضح ثبوت ہے ۔ ان کی غزل کا اپنا رنگ ہے ۔ ان کے اشعار میں ندرت بھی ہے اور نغمگی بھی ۔ چند اشعار دیکھیے :

روز قسطوں میں محبت کیسی\
لمحے لمحے کی اذیت کیسی

....

دیکھا تو ہر گلاب سا چہرہ تھا آئینہ\
ہر آئنے میں عکس تمہارا ملا مجھے

....

ابولہب کی کہانی عجب کہانی ہے\
نیا جہان ہے، بڑھیا مگر پرانی ہے

....

گلوں کے بعد بھی جاتی نہیں سبد سے مہک\
مرے وجود میں اب تک تری نشانی ہے

شاعری ڈاکٹر ایوب ندیم کی شخصیت کی ایک پرت ہے ۔ ان کی شخصیت کی کئی اور پرتیں بھی ہیں ۔ وہ ڈرامانگار ہیں ، مکالمہ نگار ہیں ، اُستاد ہیں ۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار کی طرح غیر محسوس طریقے سے وہ سب پرتیں کھولتے ہیں گلاب کی پتیوں کی طرح ، جیسے ہر پتی ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے، مگر رنگ و خوش بو کے اعتبار سے بھر پور ہوتی ہے ۔ اُسی طرح ایوب ندیم نے نہ صرف ڈرامانگاری میں خود کو منوایا ہے ، بلکہ مکالمہ نگاری اور شاعری میں بھی اپنی انفرادیت قائم کی ہے ۔

پھولوں کی بات کی کبھی کلیوں کی بات کی\
ہم نے تو جو بھی بات کی ، بس تیری بات کی\
لازم نہیں ہمیشہ رہے ایک سا مزاج\
کچھ تلخ ہو گئے تو کبھی میٹھی بات کی

اللہ کا ایوب ندیم پر خاص کرم ہے کہ اس نے شاعری اور درویشی کی صفات کو یکجا کر کے ایوب ندیم کو شہرت کی ہوس اور گروہ بندی کے عذابوں سے آزاد کر دیا ہے اور یہی بے نیازی اس کے سچے اور کھرے شاعر ہونے کا ثبوت ہے ۔

بانٹ ڈالے ہیں سارے خواب ایوّب\
میرے دامن میں اب رہا کیا ہے؟

اعظم سہیل ہارون/غزلیں

(حسن عباسی کی زمین میں)

کتنی مشکل ہے زندگی صاحب\
روٹھتے جا رہے ہیں سبھی صاحب\
اعتبارِ وفا نہیں کرتا\
کر رہا مجھ سے دشمنی صاحب\
اس طرح آپ مسکرائے ہیں\
ہر طرف روشنی ہوئی صاحب\
لاکھ کوشش بھی کی مگر اب تک\
غم کی محفل نہیں سجی صاحب\
اس ردیف حسن کے کیا کہنے\
اس پہ لکھی کتاب ہی صاحب\
درد تحفہ وہ دے گیا اعظم\
آ گئی آنکھ میں نمی صاحب

....

اب ترا انتظار ہے صاحب\
کیونکہ موسم بہار ہے صاحب\
کون کہتا ہے مان لیتا ہے؟\
دل پہ کب اختیار ہے صاحب\
دل کہاں ہر کسی پہ آتا ہے\
اک تجھی سے تو پیار ہے صاحب\
سنگ تیرے جو بیت جاتا ہے\
لمحہ وہ یادگار ہے صاحب\
مر رہے ہیں غریب غربت سے\
کیسا یہ اقتدار ہے صاحب\
صاف کچھ بھی نظر نہیں آتا\
کس طرح کا غبار ہے صاحب

طویل نظم ''نوحہ گر'' پر ایک تنقیدی نظر

دانیال طریر

شہزاد نیر کی تخلیقات ایک تسلسل سے میری نظر سے گزرتی رہی ہیں اور میری کوشش رہی ہے کہ میں اس کی تخلیقات کو اس کی شعری شخصیت کے کل کی روشنی میں رکھتے ہوئے تجزیاتی عمل سے گزارتا رہوں اور یہ دیکھنے کے جتن کرتا رہوں کہ کب، کہاں اور کیسے اس کی تخلیقات اس کی شعری شخصیت سے ضویاب ہوتے ہوئے خود شخصیت کی وسعت پذیری میں معاون ہونے لگتی ہیں کیونکہ تخلیق صرف شعور سے منور ہی نہیں ہوتی بلکہ تخلیقی عمل کے دوران کوئی وجدانی لہر اچانک اس طرح ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ شعور کی روشنی میں ایک نیا رنگ تحلیل ہو جاتا ہے اور وہ سارا تناظر بدل جاتا ہے جس کے ذریعے شعور تخلیق پر اقتدار حاصل کرنے کی آرزومندی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ اصول تنقیدی عمومیت اس لئے نہیں رکھتا کہ اسے صرف ان شاعروں کی پرکھ کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جن کی شاعری کو ''فکر اساس'' کہنے میں کسی طرح تامل نہ ہو۔ شہزاد نیر کو میں فکر اساس شاعر سمجھتا ہوں۔ یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ ''فکر اساس'' شاعری کو ''تجربہ اساس'' شاعری سے مختلف اور الگ تصور کرنا چاہئے۔ کیونکہ فکر اساس شاعری تجربے کو اپنی کسوٹی پر پرکھے بغیر تخلیقی عمل کے سپرد نہیں کرتی۔ فکر اساس شاعری جلوہ نما کثرت میں کسی پنہاں وحدت کا سراغ ضرور دے جاتی ہے جس تک رسائی کے بعد مفرد تخلیقات کے مختلف رنگ منکے ایک تار میں پروئے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ شہزاد نیر کی شاعری میں جلوہ نما کثرت مجھے ہمیشہ کسی پنہاں وحدت کی جانب متوجہ کرتی رہی ہے۔ اس پنہاں وحدت کو اب تک اگر میں کسی ایک لفظ میں سمو سکا ہوں تو وہ لفظ ''تشکیک'' ہے۔ وہ اپنے اردگرد موجود تعینات، تعقلات، توہمات اور اعتقادات کو اپنی تشکیکی فکر کی میزان پر پرکھتا رہتا ہے اور یہی تشکیک اس کا تخلیقی محرک بنتی ہے۔ مجھے اس کی نظموں کے مختلف رنگ منکے اسی تار میں پروئے لگتے ہیں۔

شہزاد نیر نہ تو ترقی پسندوں کی طرح کسی پابند تخلیقی عمل کا قائل نظر آتا ہے اور نہ جدیدیت کے حامیوں کی طرح آزاد تخلیقی عمل کا داعی، اس کے تخلیقی عمل کا اسپ کبھی تشکیک کی لگام کی گرفت سے آزاد نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ وہ بے سمت بھٹکنے سے بچ جاتا ہے مگر ابھی وہ مقام بھی نہیں آیا کہ اس نے کسی نئی سمت کو دریافت کر لیا ہو۔ وہ نظم کا شاعر ہے اور نظم نگاری میں اس کے رجحان کو تخلیقی کے بجائے تعمیری قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں تعمیری کو موزونی نہیں سمجھنا چاہئے جو کسی طے شدہ پروگرام یا منصوبہ بندی کے تحت مضمون کو بذریعہ الفاظ تخلیقی ہیئتوں میں پرونے کا عمل ہے۔ شہزاد نظم کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں کہتا اس لئے وہ موزونی شاعر نہیں ہے مگر وہ تخلیقی شاعروں کی طرح اپنی شعری استعداد کو استعارے کی تخلیق پر بھی صرف نہیں کرتا۔ تخلیق اور تعمیری عمل کے فرق کو استعارے کی تخلیق میں بطور محرک ''تجربے'' اور ''فکر'' کی موجودگی سے بھی ممتاز کیا جاسکتا ہے۔ تجربہ، استعارے کے استعمال کے بجائے اس میں منقلب ہونے کا رجحان رکھتا ہے جب کہ فکر استعارے میں تقلیب کے بجائے اسے اپنی روشنی سے منور کر دیتی ہے۔ یہیں ''فکر اساس'' اور تجربہ اساس'' شاعری کی معنوی جہات بھی مختلف ہو جاتی ہیں۔ تجربہ اساس شاعری ابہام کی جو مقدار قبول کرسکتی ہے، فکر اساس شاعری یقیناً اس کی متحمل نہیں ہوتی اور اس کا اصرار یقیناً اس معانی کی جانب نسبتاً زیادہ ہوتا ہے جو تخلیقی شخصیت کے کل سے منسلک ہوتے ہیں۔ شہزاد نیر مجھے ان ہی معنوں میں تعمیری شاعر لگتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ تعمیری عمل کے دوران تخلیقی لہریں وقفے وقفے سے مگر تسلسل کیساتھ شہزاد کے ہاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جن کی مقدار کبھی کبھار تعمیری عمل کو دبا بھی دیتی ہے مگر بیش تر اس کی نظم کی تعمیریت، تخلیقیت پر غالب رہتی ہے۔ طویل نظموں کی فہرست میں ''آئینہ خانہ'' اور ''رخصتی'' کو چھوڑ کر باقی نظموں میں تعمیری عمل تخلیقی عمل پر غالب رہا ہے۔ یہاں یہ قطعاً نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان نظموں میں تخلیقیت کی مقدار سرے سے موجود ہی نہیں ہے بلکہ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مقدار تناسب میں تعمیریت، تخلیقیت سے ہر حال زیادہ بنتی ہے۔ جس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ طویل نظم بہ ہر حال صرف استعاروں کی تخلیق کے زور پر قائم نہیں کی جاسکتی۔ ''آئینہ خانہ'' اور ''رخصتی'' استعارے کی تخلیقیت کے معیار میں واضح فرق کے ساتھ اس کی

استشنائی صورتیں ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ اوّل الذکر میں استعارے کی تخلیقیت کا معیار ثانی الذکر کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے۔

طویل نظم استعاروں کی تخلیق کے پس منظر میں فکر کی بہ طور اساس موجودگی کا جو بنیادی تقاضا کرتی ہے اُس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا اور عموماً وہی تخلیق کار طویل نظم کہنے کی جانب تخلیقی رغبت محسوس کرتے ہیں جن کا فکری وژن مختصر نظموں میں سمٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔ شہزاد نیر کی زیرِ تجزیہ نظم اس کی دوسری طویل نظم ہے۔ یہاں یہ بات میرے لیے باعث حیرت ہے کہ اس نے اپنی پہلی طویل نظم ''خاک'' کو تعمیریت کے بجائے تخلیقیت کے ذریعے قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس نظم میں تعمیریت اور تخلیقیت کے تعاملی تناسب میں کوئی زیادہ فرق تو نہیں تھا لیکن تخلیقیت کی مقدار تھوڑی زیادہ ضرور تھی۔ البتہ اس دوسری نظم ''نوحہ گر'' میں اس کا رویہ خاصا مختلف ہے۔ یہاں تعمیریت کی مقدار تخلیقیت کے مقابلے میں خاصی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی یہ نظم ارتباط اور انتظام میں پچھلی نظم کے مقابلے میں سبقت حاصل کیے ہوئے ہے۔ یہ نظم خود کو استعاروں کے وفورِ تخلیق کے برعکس فکر کے تشکیکی محرک کے زیر اثر پڑھواتی ہے۔ یہ پوری نظم تشکیکی فکر کے زیر اثر پروان چڑھنے والے world out look (جسے میں کائناتی نظر کہتا ہوں) کے تناظر میں مذہبی اعتقادات کا محاسبہ پیش کرتی نظر آتی ہے اور انسانی خون ریزی کے پس منظر میں سبب کے طور پر مذہبی اعتقاد کی موجودگی ثابت کرتی ہے ۔

وہ
خدا جس کو دیکھا نہیں
اُس کی اک اک صفت پر ہزاروں خدا تھے
جو ہنستے ہوئے
ننھے بچوں کی چیخوں میں ڈوبے ہوئے
خوں چڑھاوے کو مقبول کرتے رہے
گریہ واجب ہوا

مذہبی اعتقاد کو اس نظم کے فریم ورک میں انسانی تعقلات و توہمات کی تشکیل قرار دیا گیا ہے ۔

اپنے زورِ توہُم سے افلاک آباد کرتے رہے
بے یقینی کے پہروں میں
فطرت کی بڑھتی ہوئی دشمنی کے جوانب میں بکھرے ہوئے
خوف کے آب و گِل سے خدا کو بنایا
یہاں سے وہاں
جس قدر طاقتیں بھی میسر ہوئیں
سب اسے سونپ بیٹھے۔۔۔۔۔۔ توڑنے لگے
صفاتی مرکب بنائے
ہزاروں برس تک بناتے، بڑھاتے رہے
حمد کا تخت جوڑا۔۔۔۔۔ اُسے لا بٹھایا
مگر مرد طاقت میں تھے۔۔۔۔۔ سو اسے بھی مذکر رکھا
دست رس میں نہ آ جائے
اس کو فلک پر بٹھایا

اپنے اس بنیادی تھیسس کو پیش کرنے کے لئے یہ نظم سائنسی تعقلات کے تناظر میں تخلیقِ کائنات کے عمل سے آغاز کرتی ہے اور اس کے بعد اساطیر کی روشنی میں، انسانی تہذیبی سفر کو کہیں سائنسی، کہیں مادی جدیت اور کہیں خالص تخیلاتی تناظر میں شعری قالب میں ڈھالتی چلی جاتی ہے اور استعارے اپنی معنویت کو اسی فکری پس منظر کی تحدیدات میں ڈھالتے محسوس ہوتے ہیں۔

اس نظم کی استعاراتی لسانی تشکیل کس طرح فکر بلکہ مکتبِ فکر سے ضویاب ہوتی ہے اس کا تجزیہ الگ مطالعے کا متقاضی ہے تاہم یہاں محض ایک اشارے کے لئے نظم کے وہ اقتباسات نقل کئے جا رہے ہیں جن کی استعاراتی تشکیل سائنسی فکریات بلکہ اصطلاحات سے ضویاب ہوئی ہے۔

دیکھتا تھا۔۔۔۔۔ نہ ہونے سے ہونا
خلا سے فضا
''کچھ نہیں'' سے ''بہت کچھ'' اچھلتے ہوئے
اک دھوئیں سے فلک کو نکلتے ہوئے

....

میری آنکھوں میں دیکھو
وہ گولہ یہیں گھومتا تھا۔۔۔ جسے
اپنے شعلہ فشانی گھماؤ کی آتش زنی کی خبر بھی نہیں تھی -
یہیں آتشیں ذرہ باری ہوئی
حادثاتی جدائی کا غصہ تپ جاودانی میں بدلا
تو سوزِ نہانی کمائی ہوئی
آگ پانی میں پہلی جدائی ہوئی
مفردوں کا تنوع مرکب ہوا۔۔۔۔ اور ہوتا رہا
آگ داسی تھی۔۔۔۔۔ ترکیب میں کام آتی رہی

....

سبز سیال میں تیرتے تھے زمان و مکاں
پھر اک بار چھوٹوں نے دھرتی بسائی
اور ان میں سے دو چار نے
اگلے پیروں کو ہاتھوں میں بدلا
لرزتے ہوئے ایستادہ ہوئے
اور کہنے لگے ''ہم کو مٹی نے پیدا کیا''

مبشر سعید......محبت کا شاعر

احمد شہریار

غزل کی موت کا اعلان ہر دور میں کیا گیا اور ہر دور میں چند ایسے غزل گو شعراء سامنے آئے جنہوں نے اس اعلان پر مہر باطل ثبت کرتے ہوئے اس صدیوں پرانی روایت میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا اور اس عظیم روایت کو صحیح سلامت اگلی نسل کے سپرد کیا۔ ہمارے عہد میں بھی ایسے نوجوان غزل گو شعراء کی تعداد کم نہیں جو اگر غزل نہ لکھتے تو اپنے ساتھ بھی ظلم کرتے اور اردو ادب کے حق میں بھی۔ یہ نوجوان شاعر جہاں ایک طرف غزل کی روایت سے جڑے ہوئے ہیں، وہیں عصری تقاضوں، زبان، خیال کی ندرت اور مضامین میں تازہ کاریوں سے غزل کے میدان میں اپنی موجودگی کا بھرپور جواز بھی رکھتے ہیں۔ مبشر سعید کا تعلق بھی شعراء کے اسی نوجوان قبیلے سے ہے۔ پیش نظر شعری مجموعے ''خوابگاہ میں ریت'' سے قبل، میں نے ان کی وہی شاعری پڑھی تھی جو خود انہوں نے یا ان کے پرستاروں نے فیس بک پر شیئر کی یا پھر انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ خاص طور پر ان کا درج ذیل شعر جو ہمہ وقت میرے ساتھ رہتا ہے:

تو نے نہیں ماننا مٹی کا دھواں ہو جانا
تو ابھی رقص کروں؟ ہو کے دکھاؤں تجھ کو؟

محبت مبشر سعید کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ اس کے پیش نظر شعری مجموعے میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی، جس میں یہ عنصر اپنے پورے اہتمام اور شعری اپج کے ساتھ موجود نہ ہو۔ جان کیٹس نے کہا تھا کہ سچائی حسن ہے اور حسن سچائی، اس بنا پر دیکھا جائے تو مبشر سعید کی شاعری بھی بھرپور محبت کی آئینہ دار ہے کہ ان کے اشعار میں محبت والہانہ بھی ہے اور خالصانہ بھی۔ ان کی غزلیں بہت بھرپور انداز میں ان کا تعارف کروا رہی ہیں، جن محبت کے رنگ ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں، علامتوں اور استعاروں کی خوشبو شاعر کے احساسات، جذبات اور مشاہدات کی آئینہ دار ہے۔ زبان تازہ اور موضوعات عصری ہیں۔ ان کی شاعری میں غم دوراں اور غم جاناں آپس میں ملتے ہیں تو شاعری اور پڑھنے کے لائق بن جاتی ہے۔

مبشر سعید کو اپنے والہانہ عشق کی پاکیزگی اور تقدس کا بھرپور احساس ہے۔ کہتے ہیں:

ہم محبت بھی عبادت کی طرح کرتے ہیں
واعظو! ہم کو عبادت نہ سکھاؤ، جاؤ

عشق عبادت کرتے لوگ
جاگیں روز اذانوں تک

شاعر چاہتا ہے کہ اس کا پورا وجود اس کی محبت کی گواہی دے۔ اس کا شوق اور حیرت دیکھئے:

یہ کیسا عشق ہے جو آنکھ تک نہیں آتا
یہ کیسی آگ ہے جو روشنی سے عاری ہے

محبت میں شاعر کی حالت خدائے سخن میر کی سی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی حالت یوں بیان کرتا ہے:

جو بھی آتا ہے، یہی پوچھنے لگ جاتا ہے
میں نے کیوں عشق میں یہ میری سی حالت کر لی؟

محبوب سے والہانہ محبت کے باوجود ایک درویشانہ قناعت بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتی ہے، جیسے:

یار کی صورت ضوریز کو کل شب میں نے
دور سے دیکھ لیا اور قناعت کر لی

کبھی کبھی اس کی محبت مجازی سرحدوں سے نکل کر عشق حقیقی کے دائرے میں داخل ہوتی ہے تو اس کے کلام میں تصوف کی چاشنی اور والہانہ رنگ در آتا ہے جو بہت خوش کن ہے۔ جیسے:

جہاں جہاں پہ محبت دھمال ڈالتی ہے
وہاں وہاں سے قلندر نکلنے والے ہیں

اذان دیتا ہوا آ رہا ہے حضرت عشق
سو ہم بھی اپنی صفیں ٹھیک کرنے والے ہیں

ہجر و وصال محبت کے لوازمات ہیں۔ عشق کو اپنے وجود کا حصہ بنانے والے مبشر سعید اگر ہجر کے بارے میں لکھتے ہیں، تو اس پر قطعاً تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی شاعری میں ہجر و فراق سے متعلق طرح طرح کے خیالات ملتے ہیں۔ چند ایک مثالیں دیکھئے:

زندگی ہجر ہے اور ہجر بھی ایسا کہ نہ پوچھ
سانس بھی ہار چکا، وصل کماتا ہوا میں

مجلس ہجر کی توقیر بڑھانے کے لئے
آنکھ سے اشک نہیں، خواب بہانے ہوں گے

مستقل ہجر میں رہتا ہوں تو حیرت کیسی
لگ بھی جتے ہیں کبھی روگ نہ جانے والے

یوں تو بہت اداس تھا لیکن یقین جان
مجھ سے ترے فراق میں رویا نہیں گیا

ایسا لگتا ہے کسی ہجر زدہ لمحے نے
اشک بن کر مرے چہرے پہ بکھر جانا ہے

باغ میں پیڑ نہیں، اشک لگائے میں نے
یہ بچھڑنے سے ذرا پہلے کی تیاری ہے

مبشر سعید کی شاعری میں فطرت سے محبت اور فطری مناظر و مظاہر کی بہت خوبصورت انداز میں منظر کشی ملتی ہے۔

میں پرندوں سے ہم کلام ہوا
صبح کی شبنمی اداسی میں

نہر کنارا بھاتا ہے
شہر کے باقی رستوں سے

بیٹھ جاتا ہوں کنارے سے لگا کر تکیہ
رات بھر مجھ کو سناتا ہے کہانی، پانی

دیکھ کر صبح مقدس کے نظاروں کو سعید
دل پرندوں کی طرح شور مچانے لگ جائے
کبھی کبھار میں جنگل سے جب گزرتا ہوں
ہر اک جگہ پہ درختوں کا شور ہوتا ہے
ناصر کاظمی نے کہا تھا:
دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
مبشر سعید بھی جب دنیا کو اپنی محبت کے روزن سے دیکھتا ہے تو اسے ہر چیز عاشق نظر آتی ہے۔ شعر دیکھئے:
کل میں نے چاند سے کہا آہستگی کے ساتھ
تم فرد لگ رہے ہو محبت قبیل کے
مبشر سعید ایک ایسے دور کا شاعر ہے جہاں انسانی اقدار زوال پذیر ہیں۔ اس کے زمانے میں ادب ہو یا سیاست، ہر چیز افراتفری اور بدنظمی کا شکر ہے۔ ہر شے پر زوال اور نابودی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ ایک حساس دل شاعر کے لئے ان حالات کا مشاہدہ جہاں ایک طرف اس کے رزقِ سخن میں فراوانی کا باعث بنتا ہے، وہاں دوسری طرف اس کے کرب میں بھی اضافہ کرتا ہے، وہ کرب جسے صرف ایک حساس شاعر کا دل سہار سکتا ہے اور جسے وہ اپنے الفاظ کے قالب میں ڈھالتا ہے تو وہی دکھ خالص کندن بن کر کاغذ پر بکھرنے لگتا ہے۔ اشعار دیکھئے:
مجھ کو تنہائی سرِ شام بتاتی ہے سعید
کیسے گمگشتہ ہوئے سارے زمانے میرے
جانے کس شہر سے یہ ہجر ستارہ لے کر
ہم کہ بازار میں آئے ہیں خسارا لے کر
صاف کہتی ہے مجھے دشت کی تاریخ سعید
خاک ہوتے ہیں یہاں خاک اڑانے والے
شاعرانہ تعلّی تمام تر شعراء کے ہاں موجود رہی ہے۔ ہر شاعر نے کسی نہ کسی رنگ میں اس کا اظہار کیا ہے۔ مبشر سعید بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں، بس ان کے اظہار کا طریقہ ذرا صوفیانہ اور الگ رنگ ڈھنگ کا ہے۔
اتنی توقیر جو میری ہے زمانے میں سعید
رنگ ہے مجھ پہ یہ مرشد کا چڑھایا ہوا رنگ
ہر چیز فنا پذیر ہے اور ہر عروج کے لئے ایک زوال ہے۔ سو مبشر سعید کو بھی اس بات کا ڈر لاحق رہتا ہے۔ کہتے ہیں:
میں اپنے آپ سے اکثر سوال کرتا ہوں
ترے عروج کا کتنا زوال باقی ہے؟
مرے مولا! تو مجھے ایسی اذیت سے بچا
جب خریدار مرے دام گھٹانے لگ جائے
"جہاں بھی دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے" کے مصداق اس شعری مجموعے سے چند اشعار پیش خدمت ہیں:
میں اداسی کا گیت ہوں لیکن
دل سہولت سے گا رہا ہے مجھے
ہجر نے بور نہیں، عشق اٹھایا ہے میاں
اب درختوں سے بھی منسوب فسانے ہوں گے
جانے کس موڑ پہ لے آیا ہے جیون مجھ کو
چار اطراف سے آتی ہے صدائے گریہ
ایک کشتی اداس بیٹھی ہے
ایک دریا بلا رہا ہے مجھے
عجلت میں نہیں ہوگی تلاوت ترے رخ کی
آ بیٹھ مرے پاس ذرا دیر سکوں سے
جاگ کر پتھروں کے پہلو میں
رات بھر آئنے بناتا ہوں
سانحے گزر گئے
سانحے میں ڈھال کر
عرش سے فرش تک اداسی ہے
عرش تا فرش کربلا تو نہیں؟
یہ ہر کسی کو دکھائی دیتا ہے
ایک موسم رکا ہوا مجھ میں
یہ جب بھی اس سے ملتا ہوں
بھر جاتا ہوں شعروں سے
حالت دریا بھی کبھی رک کے کیا کرتا تھا
اب تو ہر موج گزرتی ہے اشارہ کرکے
جب سے جاگی ہے ترے لمس کی خواہش دل میں
رہنا پڑتا ہے مجھے خود سے کنارا کرکے
کرنیں ملنے آتی ہیں
گھر کے روشن دانوں تک
یعنی پھر میرے مقدر میں وہ ساعت آئی ہے
پہنا ہے یار نے اب میرا بتایا ہوا رنگ
چل رہا تھا تو کئی لوگ مرے بازو تھے
گر پڑا ہوں تو کوئی ہاتھ بڑھانے کا نہیں
تو نہیں مانتا مٹی کا دھواں ہوجانا
تو ابھی رقص کروں، ہو کے دکھاؤں تجھ کو؟
میں کنارے سے دیکھ سکتا ہوں
کوئی دریا ہے اس کی آنکھوں میں
لوگ مرتے ہیں اس کی آنکھوں پر
کچھ تو ایسا ہے اس کی آنکھوں میں
تجھ کو معلوم ہے درویش نگاہوں والی
ہم تری دید کو ملتان سے آئے ہوئے ہیں
میں مبشر سعید کے اس پہلے مجموعے کا خیر مقدم کرتا ہوں جسے یقیناً ادبی حلقوں میں بھی خاطر خواہ پذیرائی ملے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آسمانِ سخن پر طلوع ہونے والا یہ ستارہ نئی سحر کی نوید بن کر چمکتا رہے گا اور اس کے خوشبو میں گندھے ہوئے لفظ مشامِ جاں کو تادیر مہکاتے رہیں گے۔

سچائی کے خدوخال

حمیرا راحت

اگر میں یہ کہوں کہ نئے آنے والے شعراء کی صف میں سبیلہ انعام صدیقی ایک ایسی شاعرہ ہے جو ادب کے کینوس پر سچائی کے خدوخال کچھ اس طرح بناتی ہے کہ اُس کے لفظوں کا سحر دل کو چھو لیتا ہے تو بے جا نہ ہوگا سبیلہ نے بہت کم عرصے میں اپنے لیے نہ صرف مشاعروں کی دنیا میں جگہ بنائی ہے بلکہ اُس کی شاعری تواتر کے ساتھ ادبی میگزین اور رسالوں میں بھی شائع ہو رہی ہے اور سوشل میڈیا پر بھی خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہے۔ یہ بات یقیناً بہت خوش آئند ہے۔ ادب ہو یا زندگی کا کوئی بھی شعبہ، اس میں نئے خون کی ضرورت ہمیشہ ہی رہتی ہے تاکہ نئے خیالات، نئے جذبات اور نئے تجربات سامنے آسکیں۔ یوں تو سبیلہ انعام صدیقی غزل اور نظم دونوں ہی اچھی کہہ رہی ہے لیکن میں سبیلہ کو غزل کی شاعرہ سمجھتی ہوں کیونکہ مجھے ایسا لگتا ہے شاید غزل اُس کے خمیر میں شامل ہے۔ آج کل غزل پر جو بے معنی تجربات کیے جا رہے ہیں اور انھیں ایک ''نیا راستہ'' قرار دیا جا رہا ہے سبیلہ نے ان سے بچنے کی لاشعوری کوشش کی ہے اور اس کی شاعری پر کلاسیکل ادب کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ پرانی روایات کا بھرم اور انہیں اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی غزل میں ایک رچاؤ ہے، مٹھاس ہے اور نغمگی بھی

''وفا کے راز سے پردہ نہیں اُٹھاؤں گی
میں دل کے زخم ہر اک حال میں چھپاؤں گی
اگر تمہاری نگاہوں میں یہ کھٹکتا ہے
سنو! میں آج سے کاجل نہیں لگاؤں گی''

سبیلہ انعام صدیقی کی شاعری میں آج کی عورت کا احساس بولتا ہے وہ عورت جیسے اپنے مسائل کا ادراک ہے، وہ عورت جو ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کرنا جانتی ہے۔ وہ عورت جو اپنی محرومی کو مجبوری نہیں بناتی اور یقین رکھتی ہے کہ:

''لوحِ ادب پہ نقش ہنر چھوڑ جاؤں گی
طرزِ بیان، حسنِ نظر چھوڑ جاؤں گی
روشن کریں جہان کو جو اپنی ذات سے
دنیا میں ایسے شمس و قمر چھوڑ جاؤں گی ''

''روتی نہیں ہوں میں کبھی دنیا کے سامنے
رکھتی ہوں حوصلہ میں نہایت کمال کا ''

سبیلہ کی شخصیت میں جو دلکشی معصومیت، خلوص اور سچائی ہے وہی مجھے اُس کے کلام میں بھی نظر آئی۔ اگرچہ یہ کلام ابھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے مگر جو انتخاب مجھے موصول ہوئے ہیں وہ مجھے اس کی ذات کی خوبصورتی کا عکس لگتا ہے۔ سبیلہ نے اپنی شاعری میں زندگی کو لکھا ہے۔ زندگی میں در آنے والے اندھیرے اور اجالے کی بات ہے۔ اس کی شاعری امید کی شاعری ہے۔ وہ امید جو آہستہ آہستہ یقین میں بدل جاتی ہے اور یقین سے بڑا سچ کوئی اور نہیں ہوتا۔ وہ ایک معصوم سی خواہش کا ہاتھ تھام کر کہتی ہے۔

''بادِ صرصر بھی قربت کی چلتی رہے دن نکلتا رہے شام ڈھلتی رہے
زلف ہاتھوں سے تیرے سنورتی رہے دن نکلتا رہے شام ڈھلتی رہے''

جہاں میں جس کی شہرت کُو بہ کُو ہے
وہ مجھ سے آج محوِ گفتگو ہے
کبھی وہ پیار سے اک پھول لائے
بہت دن سے مری یہ آرزو ہے''

''اس زیست کی تلخی سے تو اچھی ہے مری نیند
تتلی کبھی پھولوں سے ملاتے ہیں مجھے خواب''

سبیلہ انعام صدیقی کی شاعری میں ہمیں زندگی کے مروجہ اصول و آئین کے خلاف احتجاج بھی نظر آتا ہے اور زندگی کو ایک نئے انداز سے برتنے کی خواہش بھی۔ یوں بھی ادب نیکی، خیر اور محبت کا شعور بخشتا ہے اور ادیب ہمیشہ انسان دوستی، خیرسگالی اور انسانیت کا درس دیتا ہے اور انسان کے گرد جگمگاتی اس روشنی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اب کہیں گم ہوگئی ہے۔ سبیلہ نے بھی اپنی شاعری میں اُسی روشنی کو آواز دی ہے۔

جو باکردار ہو اس کو سیانی کون کہتا ہے؟
کسی مزدور کی بیٹی و رانی کون کہتا ہے؟
جو میرے لب نہیں کہتے مرے اشعار کہتے ہیں
جو دل تحریر کرتا ہے زبانی کون کہتا ہے؟

کینہ، حسد، ہوس کہیں تہمت میں مبتلا
ہے دورِ آگہی بھی جہالت میں مبتلا
اسی خیال سے نیکی ضرور کرتی ہوں
کہ بوند بوند سے تالاب بھر ہی جائے گا
کردار زندہ رہتا ہے مرنے کے بعد بھی
یہ حسن لمحہ بھر کی کہانی ہے اور بس
سبیلہ میرے پاس صرف نعمتِ خلوص ہے
محبتیں ہی بانٹتی ہوں میں نظامِ دہر میں
خنجر کا اعتبار نہیں وہ تو صاف ہے
لیکن ملے گی خون سے قاتل کی آگہی
یہ حکمت ہے سبیلہ زیست میں رب نے کمی رکھی
وگرنہ ہر بشر خود میں خدا سا ہو گیا ہوتا

سبیلہ انعام صدیقی کا سفر تیزی سے جاری ہے۔ وہ نئے امکانات کی شاعرہ ہے، ایک ایسی شاعر جس کے کلام میں پرانی قدروں کا احترام اور روایتوں کے پاسداری بھی جگمگاتی نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے۔ جس میں اس کی اپنی ذات کے فسانہءِ حیرت کے علاوہ اپنے اردگرد سانس لیتی دنیا کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ کامیابی کی بہت سی منزلیں سبیلہ کی منتظر ہیں۔ اُس کا فن، اس کی شاعری کی چمک کتنے آسمانوں کو سر کرے گی۔ اس کا انتظار سب کے ساتھ ہمیں بھی ہے۔

حاصلِ رخت (تقریظ)

قاضی دانش صدیقی

یوں تو موجودہ وغیر موجودہ اس کائناتی ڈھانچے میں سانس لیتے ، پنپتے اور دھڑکتے ہوئے ہر ایک شے کی تفہیم کرتے کئی مختلف اصناف کے حامل دیگر علوم فلسفہ وفلکیات، خدائے حرفِ کن نے تخلیق کرنے کے ساتھ ہی اس کی ترسیل کی ذمہ داری صوت وحرف سے گندھے نطق کے حوالے کیا کی اس کے توچہرۂ ابلاغ پہ نکھار آ گیا ،ایسے میں اہلِ ذوق کی سماعتوں کا ششدر رہ جانا کوئی اچنبھے کی بات نہ رہی ،لوگ منظوم اور سحر انگیز گفتگو سے حظ اٹھاتے اٹھاتے مسندِ سخن کے ورثا کے فہرست میں شمار ہونے لگے اور شاعر کہلائے ،اُس عہدِ پارینہ سے لے کر اِس دورِ جدید تک بقول میر تقی میر کے اس مصرعے کی مصداق "آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد " کئی عظیم المرتبت شعرائے عظام جوق در جوق کوچہ ءثقافت میں اپنے اپنے حصے کی شمعیں جلانے کے ساتھ ساتھ اپنی تمام فنی صلاحیتیں بھی اپنے تلامزہ تک بمطابق گنجائشِ ادراک منتقل کرتے ہوئے جاوداں ہو گئے ،اور یوں متضاد انواع علوم کی پیشانی سے پھوٹتی روشنی شاعری کی راہ پر گامزن رختِ مسافرانہ کے جمالیاتی تصور کے ساتھ کئی سو سالہ ارتقائی سفر کی طویل مسافت پر محیط و منعکس شجرۂ نژاد کی متحمل ٹھہری اور اسی شجرہ ءحسب و نسب میں ایک زیب یافتہ ومعتبر نام صائمہ اسحاق کا بھی مندرج ہو چکا ہے جو سخن آرائی کرتی آسمانِ تغزل پر کسی ماہ پارے کے صورت منور و تاباں ہے۔

صائمہ اسحاق ایک زود گو شاعرہ کی حیثیت سے ادبی منظر نامے پر اپنی شناخت رکھتی ہے اور جس کا سفر اپنے پہلے مجموعہ ءکلام "حاصل" ہی سے کامیابی کے ساتھ منازل شہرت کی جانب رواں دواں ہے ، یوں تو صائمہ اسحاق کا شعری سفر روایت اور جدت کے بین بین ہے جو اس کی اسلوبیاتی تراش کو منفرد بناتا ہے یا یوں کہیے کہ صائمہ اسحاق کے یہاں اس کا تخلیقی وجدان ہی اس کی شاعری سے متصل ہر لفظ کی باطنی کیفیات کو ایک الگ ڈھنگ سے برتنے کا جو یا اور اس کی زندگی کے مشاہدات کی مکمل ترجمانی کا قائل ہے،۔ صائمہ اسحاق کا طرزِ اظہار سلیقہ مندی سے عبارت ہے فطرتاً کسی بھی شاعر یا شاعرہ کی شاعرانہ صلاحیتوں سے منسلک اظہار کی آزادی کے مقید ہونے کا خوف ہی اسے لاشعوری یا ابتدائی طور پر سماجی و ثقافتی پابندیوں کے رد پر مصر نئے جہتوں کے تعین کو یقینی بنانے کی سعی میں مبتلا کو ہسارِ ناممکنات کو تراش کر اپنی منزلوں کے واضح خال وخد ابھارنے میں مصروفِ عمل رکھتا ہے تاہم ضروری جاننا یہ ہے کہ معاشرتی ناانصافیوں کے مقابل کسی بھی شاعر نے اپنی سرشت کے باغیانہ رویے کو کتنی قوت سے برتنے کا ہنر پایا ہے اور یہی وہ میزان ہے جہاں فکری بلوغت سے حسِ بغاوت کی گونجتی للکار کے منسلک ہونے کی مختلف وجوہات کو اعتبار بخشا جا سکتا ہے، تاوقتیکہ یہ سخن آرائی اپنے خالق کے باطنی اور انحرافی احساس کی ایک ظاہری اور تحریری صورت کے متوازی قرار دی جا سکے اور جو شاعر کی خلاقیت کے اندرونی احساسات و خیالات کی بیرونی طور پر ترجمانی کرنے کی اہلیت سے بہرہ مند بھی ہو اور جو بھی تخلیق اس میزان پر اپنا وزن برقرار رکھتے ہوئے نہیں چوکتی یقیناً وہ ایک عمدہ اور بہترین تخلیق کے زمرے میں اپنا شمار رکھتی ہے ۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں صائمہ اسحاق سے میرا پہلا ادبی تعارف بذریعہ ءحاصل (موسم اشاعت :2015) ہوا جو کہ صائمہ اسحاق کا پہلا شعری مجموعہ ہی نہیں اس کی فزوں پروازی کا شاہد بھی ہے جبکہ اس وقت جو میرے زیرِ مطالعہ کتاب **بعنوان رخت** ہے یہ اس شاعرہ کے دوسرے قدم کی مماثلت لیے ایک بھرپور تخلیقی جست کے مترادف ہے اور پھر اس مجموعے کی شاعری میرے نطق و زباں کو اس کی مصنفہ کو شاعرہ کہنے پر پہلے ہی قائل کر چکی ہے لہٰذا صائمہ اسحاق کی جو شاعری ہے وہ بلاشبہ جمالیاتی تنوع کا ایک برملا اظہار ہے۔ جو اس بات کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ یہ شاعر سطحِ قرطاس پر بہ اعتبارِ سخن سازی آپ ایک مجموعی تاثر کی حامل تخلیقات سے مزین قارئین ادب کے لیے ذہنی وفکری بالیدگی کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ میرے قائم کردہ مقدمہ کا حاصل بھی ہے۔

اشعار دیکھیے۔۔۔

یہ کڑا وقت ملا دیتا ہے مٹی میں انا
کیسے کیسوں سے مدد مانگنی پڑ جاتی ہے

تیری دنیا کے ضوابط نے دکھایا ہے یہ دن
تیرے جیسوں سے سند مانگنی پڑ جاتی ہے
راکھ کردے گا ترا قصر یہ بھوکا دوزخ
گاؤں کے صاحب ثروت ترا اللہ حافظ

تیرے ایفا سے جہاں اور بھی حیراں ہوگا
اپنے مسلک پہ ٹھہر، عہد فراموشی کر

زمیں قدموں تلے سے کھینچ لوں گی
تُو میرے آسماں کو کھینچتا ہے

یہ ہے وہ باغیانہ لہجہ جو کہ اس شاعر کے غیر متوقع خوبصورت اور منفرد طرزِ اظہار میں تخیلاتی متانت لئے اپنے قارئین کی سماعتوں میں افزائشِ ارتعاش کا ایک واحد مدعٰی ہے ۔صائمہ اسحاق کی شاعری بہ اعتبارِ موزونیت اپنی دائرانہ وسعتوں کے مدار کا ایک مرکزی نقطہ تو ہے ہی علاوہ یہ کہ لہجہء بغاوت کے ماتحت پنپتی مضمون آفرینی میں سلگتی چنگاریوں کو ایک بھڑکتا شعلہ بنانے کی صلاحیتوں سے مزین و آراستہ بھی ہے جو کہ یقیناً اس کی سخن آرائی کے تخلیقی پھیلاؤ کی معاون ہے ۔عمومی طور پر کسی بھی صاحبِ اسلوب شاعر کی شاعری کا مجموعی تاثر ہی اس کی فنی تموج کی منزلت کے تعین کو یقینی بناتے ہوئے کسی بھی صاحبِ طرز شاعر کی فنی شخصیت کا ایک نادر و کم یاب پہلو کہلاتا ہے اور یہ وہی مرحلہ ہے جس کے مد و جزر عبور کرتے ہی شاعر اپنے شاعرانہ تشخص کی وادیء سبزہ زار کو پاؤں سے اپنے فقط ایک قدم کی دوری پر پڑا پاتا ہے ۔جبکہ ہم اسی بات کو اگر سماجی و ثقافتی تناظر میں رکھتے ہوئے اس کا اجمالی جائزہ لیں تو بلا شبہ ہم اردو شاعری کے حبس زدہ دورِ ارزانی میں سانس لے رہے ہیں جہاں ادبی سرگرمیوں کے انعقاد اور سرپرستی کا سہرا غیر ادبی لوگوں کے سر ہے جو یقیناً باہمی استخلاف کے ذریعے صاحبِ فن کے استحصال کا موجب ہے اور ایسی صورت حال سے نبرد آزما ہو کر اپنی آواز کی ایک منفرد شناخت کی تشکیل یقیناً آپ ایک قابل ستائش امر ہے۔۔۔

علاقہ ہے مجھے پروازگی سے
تبھی تو بال و پر بخشے گئے ہیں

تجھے کیا کیا وضاحت دوں زمانے
مجھے بھی کچھ ہنر بخشے گئے ہیں

یہ مانا کم ہنر ہوں تُو دکھا دے
تجھے اتنے بھی گر بخشے گئے ہیں

صائمہ اسحاق کی شاعری معنویت کی فسوں کاری ہے جو اپنے آپ میں ایک طلسماتی اور موہوم مضامین کو اس پیرائے میں منقش کرتی ہے کہ گویا یہ عمل اجسام مناظر میں روح پھونکنے کے مترادف ہو اور یہی سحر انگیزی اپنے مکمل طُمطُراق کے ساتھ جب سامعین کے ذوقِ سلیم کو محظوظ کرتی ہے تو بے ساختہ صدائے آفرین کا غُلغلہ محفل کو گرما دیتا ہے شعر دیکھیے۔۔۔

میں ساحلوں پہ گھروندے بنانے والی تھی
وہ موجِ قہر تو میری طرف بپھر آئی

دیکھیے کس خوبصورتی سے دنیاوی ناپائداری کو شعریت کا جامہ پہناتے ہوئے اس مفہوم کی منظر کشی کی گئی ہے جو کہ استعاراتی طور پر ساحلوں پہ گھروندے بنانے کے اس عمل کو دنیاوی جاہ و حشم کی طلب یا دولت مندی کے حصول کی طرف ایک مُبہم اشارہ ہے جس کی تعمیر میں انسان اپنی پوری عمر صرف کر دیتا ہے اس بات سے بے خبر کہ ایک بپھری ہوئی موجِ قہر بصورتِ مرگ اس کی خواہشات کے اس گھروندے کو ڈھانے کے درپہ ہے۔

ٹپکا رہا ہے ذہن پر سیال روشنی
کشفِ دروں اجال سے آگے کی چیز ہے

ایسا شعر کہنے کو ریاضت شرط ہے اس شعر کو شاعر کے مطالعاتی مزاج کے ایک فکری اظہار کے مماثل قرار دیا جائے تو میں سمجھتا ہوں اس میں قطعاً کچھ مذائقہ نہیں ،شاعری کام ہی انشاء پردازی کو سلیقہ مندی میں ضم کرنے کا ہے ۔جہاں ایک سخنور ابہام کی جمودی کیفیت سے نکل کے اپنے شاعرانہ لہجے میں وثوق کے متفرقہ اور تغیراتی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے اور یہ مقام تحیر کے جمود سے آگے کا ہے جہاں تخلیق کار ذہنی اعتبار سے اس بات کا معترف ہے کہ روشنی قطرے کی مقدار ٹپکانے سے مکاشفاتی در و دیوار پر یہ سیال اجالے بھیگنے سے تو رہے، یعنی ذہن و ادراک پر جو یہ اجالے ذات کی اندرونی قوتِ مکاشفہ سے مستعار ایک سیال روشنی ٹپکا رہے ہیں حقیقتاً کشفِ دروں کا پھیلاؤ اس سے بہت آگے کا مرحلہ ہے ۔جیسے کہ سورج کی قطرہ بھر روشنی ہی ہماری آنکھ کو چندھیانے کے لئے کافی ہے مگر اس کے برعکس سورج کی روشنی کا پھیلاؤ ہماری چشمِ ادراک سے کئی گنا اپنی وسعتوں کے ایک واضح جواز رکھتا ہے اور یہ بات اس شاعر کے یہاں اتنے وثوق سے کہی جا رہی ہے کہ یقیناً اس میں تشکیک کی کوئی گنجائش ہی نہیں اور یہ وہی اسالیبی پختگی ہے جو کتاب ہذا سے متعلق ہے

مزید اشعار دیکھئے

آج ثابت بھی کرے صائمہ اپنا ہونا
مار ڈالا ہے تو چھاؤں میں بھی ڈالے آکر

کھل گئی ایک گرہ اندر سے
اور اٹھتے گئے نقاب مرے

بات کرنے سے لب چٹختے تھے
میں نے پتھر بنا لیا خود کو

یہ ہوا کچھ مزید مانگنے سے
جو تھا موجود وہ بھی سارا گیا

بانجھ ہوتی جا رہی تھیں کائناتیں جس گھڑی
سب عناصرِ مل کے ہم آغوش درماں ہو گئے

مان جاتے ہیں ذرا دیر مباحث کر کے
سر پھرے مجھ سے جو دو چار الجھ جاتے ہیں

بڑی ہی مطلبی ساعت تھی، ہنس پڑی یک دم
وہ مری ذات سے مصرع کشید کرتے ہوئے

یہ کیا ذرا سے تغافل پہ جان دیتے ہو
کرو گے کیا جو کہیں دیکھ لو ستم میرا

جو کڑواہٹ انڈیلی تھی جڑوں میں
اثر پھولوں کے رس میں آ گیا ہے

صائمہ اسحاق کی شاعری میں تلازمہ کاری اپنے مکمل وفور کے ساتھ جلوہ گر ہے جو اپنا ایک مخصوص انداز لیے قاری کا ارتکاز اپنے محاسن پر منعطف رکھتی ہے جو اس کے فنی ولسانی معائب کو اتنی خوبصورتی کے ساتھ قاری کی نظروں سے اوجھل کرتا ہے کہ حیرت ہے اور یہی خوبی کسی بھی تخلیق کار کے لیے مسندِ افراز کا تعین کرتی ہے باوجود اس کے میں سمجھتا ہوں کسی بھی سفید تختی پر ایک سیاہ نکتے کی موجودگی ہی اس تختی کے اجلے پن پر کئی سوالات کو جنم دیتی ہے اور اسی لئے میری اس تجویز کا ادراک ایک سچے اور مخلص ترین تخلیق کار کے ادبی سفر میں بامثل رخت کے ہے۔فنی اعتبار سے جو لکھاری فنی ولسانی معائب سے پاک اپنے انفرادی طرز کے مطابق اپنی تحریر میں اپنے ذاتی تجربات کی شمولیت کا متحمل نہیں اس کی تحریر اس نومولود کی طرح ہے جس کے سینے میں دل تو ہے مگر اُس دل میں دھڑکن نہیں برخلاف اس کے صائمہ کے یہاں کیفیات یا احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے لہجہءِ ملتجی سے گندھے اشعار کی ایک تعداد ہے جو اس کے عصری شعور یا ذاتی تجربات کی تصویر کشی پر مائل اس کی زندگی کے مختلف ادوار کی غمازی کرتے ہیں جیسے---

اونچی ہواؤں میں بھی تو ہونا ہے تار تار
تو پھر کسی کے ہاتھ نہ آنے کا فائدہ

جب دیکھ ہی لئے گئے عیب و ہنر تمام
تو پھر کمالِ ضبط چھپانے کا فائدہ

آسمانوں سے کہیں دور تھی منزل میری
پر وہ اڑنے کو زمینوں سے تو جانے دیتا

ٹوٹیں کہ کہیں اور یہ سحر اپنا چلائیں
یہ چوڑیاں پہلے مرے بازو سے تو نکلیں

سو جتن تھے تری مسافت میں
جتنے ممکن تھے سارے کر رکھے

بڑی تکلیف ہوتی ہے قسم سے
وہ جب لہجہ بدل کر بولتا ہے

جانتی ہوں پہاڑ کرلے گا
کس لئے پھر اسے مَیں رائی دوں

سرفروشی کی پرکھ ہے تو یہ آشفتہ سری
سانپ کے ساتھ دفینے میں کہیں رکھ دینا

وقت لبریز ہی رہتا تو سنور سکتا تھا
سب خرابی ہوئی لمحوں کے ابل پڑنے سے

بٹن کے ساتھ کہیں دل بھی ٹانک دینا تھا
پتا تو چلتا کہ کس کس طرح نگاری ہوئی

ہم وہ ظلمت نصیب ہیں جن کو
روشنی چھو کے لوٹ جاتی ہے

اب مجھے ہارنا ہوگا کہ مرے دشمن نے
اپنے ہتھیار مری شان میں رکھ چھوڑے ہیں

صائمہ اسحاق کی شاعری بزورِ قوتِ متخیلہ مَس کی مماثل اپنی فکری سرشت کی مخالفت سے ماورا اپنے افکار و خیالات کو جب مُہال کی طرح آراستہ کرتی ہے۔تو اپنے لئے فطرت کے طے شدہ آئین وقوانین کی پاسداری کو یقینی بناتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری دونوں صورتوں میں چمنستاں کے پھولوں سے عرق کشید کرنے پر خود کو معمور ہی نہیں رکھتی بلکہ اس سے بڑھ کے اسے شہد سا سلسلا مادہءِ شیریں بنانے کے فن میں اپنے انفرادی اسلوب کو برقرار بھی رکھتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ شاعرانہ حواس اپنی قوتِ سماعت و بصارت کو بروئے کار لاتے ہوئے برہنہ سے عمومی مفاہیم کو لباسِ شعریت میں ملبوس اپنے آہنگِ ناطقہ کے ذریعے خیال کی وسعتِ پرواز کو ایک اختصاص عطا کرتے ہیں جو یقیناً اپنے قاری کے ذوقِ سلیم پر احساسِ شگفتگی کا موجب ہے اور جو شاعر جس قدر اس ہنرمندی سے واقفیت کا حامی ہے وہ اُتنا ہی مسندِ افراز کا زیادہ مستحق ہے بقولِ جگر مراد آبادی

ع۔جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

نئی نسل کا نمائندہ شاعر...... حسن عباسی

ریاض ندیم نیازی/سبی

یوں تو بے شمار شاعر عہدِ موجود میں شعر کہہ رہے ہیں اور خود کو غزل کے شاعر ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں مگر اُن کی شاعری تک بندی اور قافیہ پیمائی سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ کچھ شاعر عروضیے ہوتے ہیں جو اوروں کے کلام میں معائبِ سخن تلاش کرتے پھرتے ہیں حالاں کہ اُن کی اپنی شاعری میں غنائیت ہوتی ہے اور نہ شعریت۔ اُن کے کلام میں عروضی خوبی کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا مگر حسن عباسی کا شمار عصرِ حاضر کے اُن شعرائے کرام میں ہوتا ہے جو غزل کو غزل ہی کے انداز میں لکھ رہے ہیں۔ ایک ایسے ہی شاعر کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

لکھتا ہوں میں غزل کو غزل ہی کے رنگ میں
کہتے ہیں لوگ شاعرِ رنگیں نوا مجھے

دراصل شعر کو شعر بنانا ہی اصل ہنر ہے اور حسن عباسی اِس ہنر سے بہ خوبی واقف ہیں۔ حسن عباسی کو پاکستان کے متعدد نقادوں نے ''رومان پرور'' شاعر لکھا ہے۔ میں یہاں اس میں اتنا ضرور اضافہ کروں گا کہ حسن عباسی ایک کمٹمنٹ کا شاعر ہے جس نے نہ صرف محبت و رومان کے موضوع پر شعر کہے ہیں بلکہ اُن کو فنی مہارت، ندرتِ خیال، تخیلات کی بلند پروازی، غنائیت، شعریت، سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت سے مزین کیا ہے۔ یہ فن بہت کم شعرا کو آتا ہے اور نئی نسل کے شعرائے کلام میں تو اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ مگر میں نے حسن عباسی کو ''نئی نسل کا نمائندہ شاعر'' اس لیے کہا ہے کہ اُن کے اشعار نئی نسل کے احساسات کے غماز بھی ہیں اور اُن کے جذبات کی ترجمانی بھی کر رہے ہیں۔ ان کے کلام میں نئے زمانے کے تقاضے بھی ہیں اور عہدِ موجود کی ترقی یافتہ صورت کے لوازمات بھی۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

صحن کی تنہائی چگنے کے لیے
کچھ کبوتر اپنے گھر لے آؤں گا

....

اس کے جانے کی دیر تھی پھر اشک
ایک کے بعد دوسرا نکلا

....

اس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

....

اپنی دہلیز پہ کچھ دیر پڑا رہنے دے
جیسے ہی ہوش میں آؤں گا چلا جاؤں گا

....

وہ مرنے سے بہت ڈرنے لگا ہے
اسے اتنی محبت دے رہا ہوں

حسن عباسی نے کئی ممالک کے ادبی دورے کیے ہیں اور متعدد مشاعروں میں داد و تحسین وصول کی ہے اور یہ اس سبب سے ہوا ہے کہ اُن سے پہلے اُن کے معروف اشعار ان ممالک میں سفر کر جاتے ہیں جن کی بدولت دیارِ غیر اور اُردو کی نئی بستیوں کے مکینوں میں حسن عباسی کو سننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ شائقین و قارئین شعر و سخن، ادب شناس، شاعر دوست حضرات اُنھیں اپنے ممالک میں مدعو کرتے ہیں اور جی بھر کے سنتے ہیں۔ یہ عزت، ادب اور احترام ہر ایک شاعر کو نصیب نہیں ہوتا۔ اللہ رب العزت یہ عزت جس کے نصیب میں لکھ دیتا ہے اُسی کو ملتی ہے۔ ہزاروں شاعروں کی محنت رائگاں ہو جاتی ہے۔ ان کی قوتِ شعری اور عظمتِ شاعرانہ کی قدر دانی نہیں ہو پاتی۔ اِس میں کچھ قصور نا قدر شناسانِ ادب کا ہوتا ہے اور کچھ دوش اُن شعرا کا اپنا۔

مگر حسن عباسی جہاں خوش نصیبی و خوش بختی کے حامل ہیں وہاں اُن کی شاعری بھی بہت اچھی ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اُن کی پذیرائی ہونا اِس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اُن کے اشعار سفر کر رہے ہیں اور قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فن و ہنر اور مشاہیرِ اُردو ادب کو متاثر کر رہے ہیں۔ حسن عباسی کے اب تک پانچ شعری مجموعے'' سائیں (حمد)''، ''صاحب (حمد)''، ''ہم نے بھی محبت کی ہے (غزل)''، ''اک شام تمہارے جیسی ہو (غزل)'' اور ''ایک محبت کافی ہے (غزل)'' شائع ہو چکے ہیں جب کہ اُن کا غزلیہ انتخاب ''بانسری میں چاند ہے'' کے نام سے ''رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی'' سے بہت خوب صورت اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ان مجموعوں کے کلام کی بنیاد پر میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حسن عباسی ''نئی نسل کا نمائندہ شاعر'' ہے۔

اللہ تعالیٰ اُنھیں حاسدوں کے حسد، شریروں کے شر اور بری نظر سے بچائے اور مزید زورِ قلم سے عطا فرمائے...... آمین۔

پسِ گماں کا شاعر......احمد سبحانی آکاش

لبنیٰ صفدر/ لاہور

شاعری تو بہت سے لوگ کرتے ہیں اور خود کو شاعر کہلوانے بلکہ منوانے کے لیے پوری تگ و دو بھی کرتے ہیں لیکن اصل شاعر وہ ہے جو بحور و اوزان کے گُر سے واقفیت کے ساتھ تخیل و ادراک کو انتہائی مہارت کے ساتھ برتنے کا فن بھی جانتا ہو۔

کچھ عرصہ قبل احمد سبحانی آکاش نے اپنا مجموعہ کلام دیا۔ اس خوبصورت کتاب میں بے شمار اشعار قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتے ہیں۔ احمد سبحانی آکاش جدید شعرا میں اُن معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنہیں مشاعرے اور شہرت کی ہوس نہیں بلکہ ادب اور شاعری سے اُن کا بے پناہ لگاؤ اور لگن اس سفر میں اُن کا رختِ سفر بھی ہے اور منزلوں کے راستے کا تعین بھی۔ وہ اکثر کہتے ہیں شہرت اور مشاعرے میرا مسئلہ نہیں ہیں۔ اپنے اشعار کے جہان میں ہمہ تن مصروف وہ حال و مستقبل کے شعرا کے لیے نئی جہات اور معنی کے نئے جہان دریافت کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ وہ تھوڑے سے مشکل پسند واقع ہوئے ہیں۔ نت نئے قافیہ و ردیف اور انوکھے انوکھے خیالات کو شاعری کے قالب میں ڈھالنا اُن کا مشغلہ ہے۔ فن زرگری کی طرح وہ فن شاعری کو نہایت نفاست اور باریک بینی سے تراشتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے جہاں قلب و ذہن نئے الفاظ و معنی سے سیراب ہوتے ہیں وہیں ہم آسان اور مشکل پہلوؤں کو ایک سنگم پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

یاد کے رُخ سے چھو گیا کل رات
دستِ شب آئنہ خصال ہوا
اپنے سائے پہ گر پڑا آکاش
آدمی اس قدر نڈھال ہوا

احمد سبحانی آکاش آسان اور سادہ زبان اور جدید اسلوب اختیار کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اپنی ذات کی تلاش، تنہائی کا غم اور شعرا کی اس لمبی فہرست میں اپنی انفرادیت اور اپنے جداگانہ اسلوب کو قائم رکھنے کی جستجو ہی جدیدیت کے اہم موضوعات رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ نئے شاعر اپنے پیش روؤں جیسی شاعری نہیں کر سکتے۔ حالات پہلے سے نہیں رہے۔ اقدار نے نئی کروٹ لے لی ہے اور نظریات کی تبدیلی نے زندگی کو ایک نئے نظریے سے روشناس کیا ہے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں جو شاعری کی جا رہی ہے، اس کی اپنی خصوصیات ہیں اور یہی شاعری نئے طرزِ احساس کی حامل بھی ہے۔ شاعر نے نہ صرف موضوعات بدلے ہیں بلکہ نت نئی لفظیات کے خوش نما تجربات بھی کیے ہیں۔ اسی طرح احمد سبحانی آکاش نے بھی اپنے اشعار میں عصری شعور کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ آج کے دور میں جب ایک انسان کا دوسرے انسان سے صرف وہی رشتہ باقی رہ گیا ہے جو ایک مشین کا دوسری مشین سے ہوتا ہے۔ وہاں محبتوں میں گندھے ہوئے جذبوں میں رنگے ہوئے شعری مجموعے تھوڑا سا حوصلہ بھی فراہم کر دیتے ہیں کہ ابھی انسان اور مشین میں تفریق کی جا سکتی ہے۔ احمد سبحانی آکاش کے اشعار بھی انسانی محبت کے جذبات سے لبریز ملتے ہیں۔

کھلتے کھلتے جو ایک دھیان کھلا
ہر نظر اک نیا جہان کھلا
ہر طرف راستے نکل آئے
آنکھ پر ایسے آسمان کھلا
زندگی کی تو زندگی جانی
سائے میں آ کے سائبان کھلا

احمد سبحانی آکاش کے اشعار میں کہیں ایک ناکامی سے مایوس اُبھرتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے تو ساتھ ہی ایک توانا، حوصلے سے بھرپور آواز اس پہلی آواز پر غالب آ جاتی ہے۔ وہ شکوہ کناں تو ہوتے ہیں لیکن مایوس نہیں۔ وہ بدلتے موسموں اور بدلتے رشتوں کو ایک حساس دل کے ساتھ دیکھتے ہیں اور پھر صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر اسے امر کر دیتے ہیں۔

احمد سبحانی آکاش کے بلند تخیل، خوبصورت الفاظ کے چناؤ، مشکل پسندی، سہل ممتنع، تشبیہ و استعارات کے عمدہ استعمال کے یہ چند ایک نمونے ملاحظہ فرمائیں:

ریگِ صحرا پہ باغباں ہونا
مار ڈالے گا، خوش گماں ہونا
اُس نے فطرت پہ چھوڑ رکھا ہے
ذرے ذرے کا بے کراں ہونا
کتنے امکان ساتھ لایا ہے
ایک امکان کا عیاں ہونا
ایسا آسان بھی نہ تھا آکاش
تنکے تنکے سے آشیاں ہونا

مجھے اُمید ہے کہ احمد سبحانی آکاش مستقبل قریب کا نمایاں اور اہم شاعر ہے۔

کچھ مزید اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نگاہ و فکر کی وسعت سے ماورا ہے تو
خود اپنے حسن کے پردے میں چھپ گیا ہے تو
یہ کائنات حوالہ ہے تیرے ہونے کا
گلی گلی ترے چرچے ہیں جا بہ جا ہے تو
سمجھ نہ پائیں مگر کچھ تو راز ہے اس میں
کہیں دیا ہے، کہیں لو، کہیں ہوا ہے تو
مرے لیے بھی کوئی راستہ نکل آئے
مرا جواز، مرا شوق جانتا ہے تو

زخم کھا کر سرکشیدہ ہو گئی
زندگی تو برگزیدہ ہو گئی
شعلۂ دل بن گیا جنگل کی آگ
ایک ہی سرخی جریدہ ہو گئی
بار بار آیا زباں پر ان کا نام
داستانِ غم قصیدہ ہو گئی
کل حقیقت جانتے تھے سب جسے
آج حرفِ ناشنیدہ ہو گئی
یاد کا ٹوٹا کھلونا رہ گیا
آرزو رنگِ پریدہ ہو گئی
ہم محبت کا اُڑاتے تھے مذاق
اب ہمارا ہی عقیدہ ہو گئی
جب کبھی اُبھری ہے بسمل کی صدا
خامشی دامن دریدہ ہو گئی

دکھ کا اظہار بھی ہم، پیار سے کرنے والے
اور تم پیار بھی تلوار سے کرنے والے
اپنے اندازِ عیادت پہ ذرا غور تو کر
تذکرہ موت کا، بیمار سے کرنے والے
توڑ کر جسم کی دیوار، نکل سکتی ہوں
میری حد بندیاں، پرکار سے کرنے والے
رات تک ذہن پہ اک بوجھ لیے پھرتے ہیں
ابتدا صبح کی، اخبار سے کرنے والے
گھر میں اب روشنیاں کیا تجھے کرنی ہی نہیں
سازشیں سایۂ دیوار سے کرنے والے
راستے خون سے اب سرخ ہوئے جاتے ہیں
حادثے، شوخئ رفتار سے کرنے والے
موت کا خوف ہے بسمل نہ ہی رُسوائی کا
پیار ہم، سر سے، نہ دستار سے کرنے والے

تمہارا حُسن اگر جمع کرنے لگتی ہوں
میں اپنی ذات کے اندر بکھرنے لگتی ہوں
وجود اپنا، سمندر دکھائی دیتا ہے
جب آنسوؤں کی تہوں میں اُترنے لگتی ہوں
کرے جو پیار کا اظہار بھی کوئی مجھ سے
میں زخم خوردۂ احباب ڈرنے لگتی ہوں
ہوائیں جھونکنے لگتی ہیں دھول آنکھوں میں
جو زندگی میں کوئی رنگ بھرنے لگتی ہوں
نہ جانے موت بھی آئے گی کتنی بار مجھے
ہر ایک شخص کے ہمراہ مرنے لگتی ہوں
اُچھال دیتا ہے دریا کا پاٹ اگر مجھ کو
تو پھر پلوں سے میں بسمل گزرنے لگتی ہوں

ہم کو قدرت نے شیشہ دیا
ہم نے پتھر سے ٹکرا دیا
روشنی کی دعا کی گئی
چاند نکلا تو دفنا دیا
آگ کے گھر بنا کر دیے
خون جسموں کو پہنا دیا
شوقِ قد آوری نے ہمیں
کتنی پستی میں پہنچا دیا
خیرخواہی کے اعلان نے
نفرتوں کے سوا کیا دیا
زلزلے باندھ کر پاؤں میں
استقامت کا نعرہ دیا
آندھیاں ان کے کہنے میں ہیں
اب نہ کوئی جلے گا "دیا"
اس کو قائم رکھے گا وہی
جس نے بسمل یہ خطہ دیا

کچھ یاروں میں انجانے، کچھ انجانوں میں یار ملے
چہرہ چہرہ خود کو ڈھونڈا تو اپنے آثار ملے
اوروں سے کیا شکوہ، اپنی فطرت سے باغی تھی
بیداری میں سوئے سوئے، نیندوں میں بیدار ملے
یہ بستی ہے شاید، ہاتھ میں پتھر رکھنے والوں کی
آئینوں میں رہنے والے لوگ، پسِ دیوار ملے
ان سناٹوں نے تو ہم کو اندر سے بھی چاٹ لیا
دل ٹوٹے یا زنجیریں، اب کوئی تو جھنکار ملے
میں بھی بسمل ان خوش بخت انسانوں کی فہرست میں ہوں
جن خوش بختوں کو لاتعداد انسانوں کو پیار ملے

دُور سے بھی نہ وہ تجھے دیکھے
آئینے میں بھی تو جسے دیکھے
زندگی کے ہر ایک صفحے پر
تیری یادوں کے حاشیے دیکھے
طے کیا راستہ وفاؤں کا
اور آنکھوں میں آبلے دیکھے
اکثر اوقات اپنے ہونٹوں پر
اشک آلود قہقہے دیکھے

تمہاری یاد میں دل کی کتاب لکھتی رہی
ہوس کے شہر میں چاہت کے باب لکھتی رہی
جو ذائقے اُتر آئے تھے تیری آنکھوں میں
میں ان کو کر کے مجسم گلاب لکھتی رہی
میں جانتی تھی تری چھاگلوں میں پانی ہے
ہوائے ہجر مسلسل سراب لکھتی رہی
عطا ہوا تھا جو کردار وہ نبھانا تھا
رہی نہ کہنے کی جب مجھ میں تاب لکھتی رہی
کھلا یہ بھید کہ وہ تھا چراغِ آخرِ شب
میں ساری عمر جسے آفتاب لکھتی رہی
وہ ایک قصہ جو لہروں پہ جگمگاتا رہا
کسی کے نام ہوائے چناب لکھتی رہی
یہ اور بات کہ کھل کر نہ تم سے کہہ پائی
مگر میں دکھ بھی سبھی اپنے جناب لکھتی رہی
میں سیکھ پائی نہ صغؔرا رفوگری کا ہنر
سو تار تار ردا کا حساب لکھتی رہی

جدائی آ پڑی ہے صحنِ جاں میں
ہوا ہے چھید میرے سائباں میں
میں بنجر خاک میں اُگنے لگی ہوں
یہ کون اُترا ہے میرے خاک داں میں
پڑا تھا وہ مرے قدموں کے نیچے
جسے میں ڈھونڈتی تھی آسماں میں
مرا روشن ستارہ کھو گیا ہے
ترے امبر پہ، تیری کہکشاں میں

بھلا صغرا صدؔف کب جانتی تھی
مجھے وہ چھوڑ دے گا امتحاں میں

تمام عمر اُن کو سوچتے رہے
کئی مناظر آنکھ سے چھپے رہے
میں خواب دیکھتی رہی تمام رات
ستارے میرا روپ دیکھتے رہے
عجیب حسرتیں تھیں اس نگاہ میں
طویل تر تھے جس سے رابطے رہے
بچھڑنے والے کی مہک تھی ہر طرف
سو دیر تک اُداس راستے رہے
جو ایک بار اس کی آنکھ نے کہی
پہیلی عمر بھر وہ بوجھتے رہے
وہ ہاتھ جو کبھی تھے میرا سائباں
وہ مجھ سے میری بھیک مانگتے رہے
وہیں کہیں پڑے تھے خواب راہ میں
جو عمر بھر تھے مجھ کو ڈھونڈتے رہے
میں تیرے دھیان میں مگن تھی اور یہاں
زمانے میرے بارے پوچھتے رہے
صدؔف اِدھر رہا ہے رت جگا اگر
اُدھر بھی خواب اُس کے ٹوٹتے رہے

جس نے کھیل رچایا میری ذات کے ساتھ
ٹوٹ رہا ہے اب تو وہ بھی ساتھ کے ساتھ
پہناتا ہے ایسے وہ مجھ کو گجرے
جیسے باندھے خود کو میرے ہات کے ساتھ
دل نے اس کو اپنا کہنا چھوڑ دیا
بدلا تھا جو شخص مرے حالات کے ساتھ
وہ میری ہمراز ہے میری سہیلی ہے
دل کی باتیں کرتی ہوں میں رات کے ساتھ
آخری سانس تلک یہ جنگ لڑوں گی میں
بندھا ہے میرا چین تمہاری مات کے ساتھ
آج یہ دنیا ہوتی میری مٹھی میں
سمجھوتہ جو کرتی اس بدذات کے ساتھ
سیکھا ہے تاریخ سے یہی صدؔف میں نے
مرنے والے مر جاتے ہیں بات کے ساتھ

سب اگر حسب حال ہو جائے
زندگانی وبال ہو جائے
میں نے چاہا نہ تھا مرا سبزہ
اس طرح پائمال ہو جائے
جس کو چاہوں وہ مجھ کو مل جائے
ایک ایسی مثال ہو جائے
تیرے دل میں اُتر سکے مری بات
درد کا اندمال ہو جائے
تو میرے کان میں کہے کوئی بات
اور مرا چہرہ لال ہو جائے
ہم کہ دریا کے دو کنارے ہیں
پھر بھی چاہیں وصال ہو جائے
مانگ لوں گی اسے خدا سے میں
دل سراپا سوال ہو جائے

ڈاکٹر رابعہ سرفراز/فیصل آباد

خدا کا شکر ہے سورج یہاں مسیحا ہے
اُجالا ساتھ ہے اب روشنی ہماری ہے

ترا عشق ہے اور مری گفتگو ہے
عجب حسن کہ آئنہ روبرو ہے
نظر میں بہت عکس ہیں جھلملاتے
مگر اک نئے کیف کی آرزو ہے
خبر ہو کسی نقش کی اے مصور
ازل سے مجھے آپ کی جستجو ہے
یہ تشنہ لبی آخرِ دم کی مہماں
ترے سامنے ظرف ہے اور سبو ہے
مرے سوز سے مضطرب ہو رہا ہے
جہاں آپ ہی آپ میں عیب جو ہے
میں جس ڈھنگ سے رابعہ اس کو دیکھوں
مرا فن مری فکر کی آبرو ہے

مری ردائے سخن کا حسیں ستارا ہے
جو خواب آج بروئے زمیں اُتارا ہے
وہ ظلمتوں میں جلا ہے چراغ کی صورت
وہ میرے بحرِ تخیل میں اک کنارا ہے
پھر ایک آن میں پلٹا ہے سائباں میرا
زمانے میں نے اسے جب جہاں پکارا ہے
مری حیات کا حاصل یہ فصل حرفوں کی
یہ لفظ لفظ بڑے پیار سے سنوارا ہے
نہیں ملال کوئی بھیڑ سے الگ ہوں میں
یہ عشق ہے مجھے سب کچھ یہاں گوارا ہے
ہوا کے ساتھ کہاں بدلے رابعہ رخ کو
تو ساتھ ہے تو ہر اک آسماں ہمارا ہے

چہار سمت خموشی ہے بے زبانی ہے
یہ جو سکوت ہے اک ظلم کی نشانی ہے
کیوں تھک کے بیٹھ گئے قافلے محبت کے
سفر طویل ہے منزل یہ جاودانی ہے
میں ہار مان لوں تجھ سے محاذ پر کیسے
مرے حریف تجھے کیوں یہ خوش گمانی ہے
تجھے ہے بیر متانت سے دشمنی حق سے
دھواں ہے آگ ہے کیا طرزِ حکمرانی ہے
لو اختتام ہے تسلیم کا ادھر دیکھو
یہ لفظ لفظ مرا عکس زندگانی ہے
کہیں یہ ہنس دیے اور رو پڑے کسی جا پر
جو مل رہی ہے حقیقی یہ کامرانی ہے
اُڑان رابعہ کی فکر کی وہاں تک ہے
وہ دیکھ دور جہاں حکمِ آسمانی ہے

یہ زندگی ہمیں تیرے سبب سے پیاری ہے
تمام رات سحر کے لیے گزاری ہے
جو مثلِ سنگ اسی راہ میں پڑے تھے ہم
ہر ایک بات حریفوں پہ اب یوں بھاری ہے
خدا کا شکر ہے سورج یہاں مسیحا ہے
اُجالا ساتھ ہے اب روشنی ہماری ہے
ابھی ابھی تو یہاں تذکرہ کسی کا تھا
سب اپنی راہ چلے دیکھ تیری باری ہے
یہ اور بات کہ وہ عکس اس بلندی پر
کہ آئنے نے جہاں اپنی چال ہاری ہے
وہ ایک رنگ مری زندگی کا حاصل ہو
جو کائنات کے ہر زاویے پہ بھاری ہے
میں رابعہ ہوں زمیں عاجزی بھری جس پر
کرم کا رحمتوں کا اک نزول جاری ہے

تیرگی میں سدا سر اُٹھا کے چلے
اک بھرم تھا جسے ہم بچا کے چلے
دیر تک دیکھ لی نارسائی تری
دور تک تیر تیری انا کے چلے
چاہتے تھے سکوں سے کٹیں راستے
درد تھا مسکراہٹ سجا کے چلے
عکس ہے مات کا مردنی سوچ کی
جھوٹ ہے تم یہاں جو سنا کے چلے
راکھ ہو جائے گا ظلم خود آگ میں
جبر کو صبر سے ہم ہرا کے چلے
قاعدے ضابطے غیر کے واسطے
ماورا آپ ہیں سب بھلا کے چلے
رابعہ کب بدلتی ہے فطرت یہاں
تجزیے لوگ کیسے تھما کے چلے

خامشی ہے مری گفتگو آج کل
شور ہی شور ہے چار سو آج کل
اب نہیں فرصتیں سوچنے کی تجھے
بس مری ذات ہے روبرو آج کل
جبر کے بوجھ سے دب چکے خواب سب
ڈھل چکے ساز میں ہوبہو آج کل
روشنی کا قبیلہ کدھر گامزن
تیز ہے رات کی جستجو آج کل
اک سراسیمگی چھا گئی ہر طرف
شہر در شہر ہے ہاؤ ہو آج کل
کاش جرات بھرا فیصلہ کر سکو
دے سکو حرف کو آبرو آج کل
کس قدر بے اماں ہو چکی زندگی
بے نشاں ہے زمیں پر لہو آج کل
رابعہ کی نظر میں ہے عکس کو
کھوجتے پھر رہے ہیں عدو آج کل

راشد علی شاہ/کینیڈا

وہ تو مائل ہے بندگی پہ مگر   تم خدارا، خدا نہیں ہونا

نام: راشد علی شاہ، لاہور میں پیدا ہوئے۔ بچپن اپنے آبائی قصبے سانگلہ ہل میں گزارا اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں سے حاصل کی۔ میٹرک کے بعد چار سال گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہے۔ 1993 میں فیملی کے ساتھ کینیڈا میں سکونت اختیار کی۔ کنکورڈیا(Concordia University) یونیورسٹی اور بعدازاں میکگل یونیورسٹی(McGill University) سے تعلیم مکمل کی۔ پیشے کے اعتبار سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ اردو اور پنجابی میں شعر کہتے ہیں۔

اپنے پندار کی تذلیل میں کر آیا ہوں
تیرے در پر نہیں آنا تھا مگر آیا ہوں
کس نے یوں دے کے دعا میری بڑھا دی مشکل
ڈوبتے ڈوبتے میں پھر سے اُبھر آیا ہوں
آبلے چار کما کر تو جہاں سے خوش ہے
عمر اس دشت میں کر کے میں بسر آیا ہوں
کیوں درِ خلد پہ مانگے ہے کوئی مجھ سے حساب
میں تو آدم ہوں حضور اپنے ہی گھر آیا ہوں
اس کا ہدیہ ہے ذرا داد کچھ آنکھوں میں چمک
پیش کرنے جو میں یہ عرضِ ہنر آیا ہوں
فخر سے تن گیا ہر سینہ مری بستی کا
ایسے میدان سے میں بن کے خبر آیا ہوں
میں کہ نوری ہوں نہ ناری مجھے ارزاں نہ سمجھ
ایک خاکی ہے سجدہ تیرے در آیا ہوں
کائناتوں کے سفر جیسی تھکن ہے راشدؔ
اپنی ہی ذات میں جب کر کے سفر آیا ہوں

شاہوں نے جب سے رسمِ جہاں گیر چھوڑ دی
ہم نے ہلائی عدل کی زنجیر چھوڑ دی
آنکھیں ملیں تو ڈھال تلک میں نے پھینک دی
دیکھا مجھے تو اس نے بھی شمشیر چھوڑ دی
وقتِ فراق اپنی ہر اک چیز لے گیا
ہاں جاتے جاتے آنکھ میں تصویر چھوڑ دی
اُٹھ کے جو میرا مرکزی کردار چل دیا
میں نے بھی پھر ادھوری وہ تحریر چھوڑ دی
ہم نے کہی نہیں ہے غزل ہر زمین میں
آئندگاں کے واسطے جاگیر چھوڑ دی
تقدیر کے تو ہم کبھی قائل نہیں رہے
اس پر ستم کہ خواہش تدبیر چھوڑ دی
راشدؔ اب حال دل نہ کسی سے کہیں گے ہم
اب کرنی ہم نے درد کی تشہیر چھوڑ دی

پھر رہینِ انا نہیں ہونا
اب ملے تو جدا نہیں ہونا
عشق کرنا ضرور تم لیکن
بے طرح مبتلا نہیں ہونا
ہے رہِ شوق میں کمالِ ہنر
دل جگر کچھ بچا نہیں ہونا
دعوئ سیرِ دشت پہ ہے گراں
پاؤں میں آبلہ نہیں ہونا
رہگذر بھی ہے منتظر تیری
طاق کا ہی دِیا نہیں ہونا
تم کہانی میں میرے ساتھ رہو
مجھ کو بے ماجرا نہیں ہونا
ماس سے ہو گئے جدا ناخن
تم تو مجھ سے جدا نہیں ہونا
کاش عالم میں معتبر ہوتا
میرا ہونا، مرا نہیں ہونا
بجھ گئیں ساری منتظر آنکھیں
قید سے اب رہا نہیں ہونا
وہ تو مائل ہے بندگی پہ مگر
تم خدارا خدا نہیں ہونا
سب تعلق غرض کے ہیں راشدؔ
اب کسی کا بھلا نہیں ہونا

شکست ذات سے ڈرنے لگا ہوں
کسی کو یاد پھر کرنے لگا ہوں
نہ غم کرنا جو میری جان جائے
میں زندہ کب تھا جو مرنے لگا ہوں
جگر کے آخری خلیے سنبھل جا
میں پیمانے کو پھر بھرنے لگا ہوں
نہ جو الزام تم دھر پائے مجھ پر
وہ خود پر خود ہی میں دھرنے لگا ہوں
ہے قدرت پر جو نازاں اپنی دیکھے
غزل میں شعر میں جڑنے لگا ہوں
تعلّی ہی سہی دعوے میں راشدؔ
مگر اس بات پر اڑنے لگا ہوں

سعدیہ سیٹھی / برطانیہ

ان بجلیوں کو روک رکھوں آسمان پر
ان آندھیوں کو پیڑ گرانے نہ دوں کبھی

کوئی دیا ہوا کو بجھانے نہ دوں کبھی
ظلمت کو اپنا راج چلانے نہ دوں کبھی
ان بجلیوں کو روک رکھوں آسمان پر
ان آندھیوں کو پیڑ گرانے نہ دوں کبھی
جو لوگ اچھے ہیں وہ رہیں میرے آس پاس
جو میرے بس میں ہو انہیں جانے نہ دوں کبھی
اتنا خیال رکھوں میں اپنی زمین کا
دل اس کو آسماں کا دکھانے نہ دوں کبھی
ننھے دلوں کو ڈر سے بچاؤں کسی طرح
پیڑوں کو پنچھیوں سے اُڑانے نہ دوں کبھی
فطرت کے ساتھ جوڑ دوں میں سب کو سعدیہ
کاغذ کے پھول گھر میں سجانے نہ دوں کبھی

پلکوں پہ آنسو عیاں ہو جائیں گے
میرے دکھ کے ترجماں ہو جائیں گے
سچ کہوں پر کبھی سوچا نہ تھا
دوست سارے بدگماں ہو جائیں گے
ایک دن پڑ جائیں گے اُس کے قدم
ذرّے اک دن کہکشاں ہو جائیں گے
برف پگھلے گی پہاڑوں سے ضرور
سوکھے دریا پھر رواں ہو جائیں گے
دُھند چھٹ جائے گی تھوڑی دیر میں
دُھند لے منظر عیاں ہو جائیں گے
رسم ہے یہ جی ملیں گے دل کہیں
دنیا والے درمیاں ہو جائیں گے

ہم سفر جب ساتھ ہوگا سعدیہ
راستے خود مہرباں ہو جائیں گے

اندھیری رات جو چھائی تو تیری یاد آئی
کسی نے شمع جلائی تو تیری یاد آئی
مری بھی حیثیت اتنی تھی تیری گلیوں میں
ہوا نے خاک اُڑائی تو تیری یاد آئی
یوں تیری یاد نے بیگانہ کر دیا خود سے
میں اپنے آپ میں آئی تو تیری یاد آئی
اسی طرح سے ملاقات ہوتی تھی تجھ سے
کہیں یہ جھیل جو آئی تو تیری یاد آئی
جڑی ہیں میری بھی محرومیاں کئی تجھ سے
کوئی بھی چیز گنوائی تو تیری یاد آئی
میں کیسے لوگوں میں جاؤں سمجھ نہیں آتا
نظر کسی سے ملائی تو تیری یاد آئی

ہمیشہ اُداسی سہیلی رہی
اکیلی تھی میں اور اکیلی رہی
میں سادہ اسے بوجھ پاتی کہاں
مری زندگی تو پہیلی رہی
جو کانٹے تھے اُن کا تو افسوس کیا
کہ سانپوں کی زد میں چنبیلی رہی
فقط اوڑھ کر صبر کی اوڑھنی
میں طوفان کتنے ہی جھیلی رہی
رہی ہر خوشی سے ہمیشہ خفا
دُکھوں کی میں بچپن سے بیلی رہی

فقط رہ گئیں یادیں ہی سعدیہ
نہ بچپن رہا نہ حویلی رہی

کب کسی کو بھلا کے سوتی ہوں
خود کو ہر شب رُلا کے سوتی ہوں
آنسو تکیے بھگوتے رہتے ہیں
ہجر کے گیت گا کے سوتی ہوں
جو کہانی سناتی تھی اماں
بچوں کو وہ سنا کے سوتی ہوں
میرے گھر میں اندھیرا ہے اتنا
شمع دل میں جلا کے سوتی ہوں
بنتی رہتی ہوں اُس کی یادوں کو
اک سویٹر بنا کے سوتی ہوں
خواب کوئی چرا نہ لے میرے
اپنی آنکھیں چھپا کے سوتی ہوں
نیند میں ہی چلی نہ جاؤں کہیں
میں وصیت سنا کے سوتی ہوں
سعدیہ یادیں جاگ جاتی ہیں
جب بھی کمرے میں آ کے سوتی ہوں

دیواریں گر گئی ہیں وہ اب در نہیں رہا
کس سے کہوں میں جا کے مرا گھر نہیں رہا
اک زخم جو کسی کو بچاتے ہوئے لگا
مدت ہوئی ہے زخم وہی بھر نہیں رہا
تعبیر جس کی مر بھی چکی خاک ہو چکی
وہ خواب میری آنکھ میں کیوں مر نہیں رہا

افسانہ

مجھے رنگ دے

عطاءاللہ عطا

صبحِ صادق کا مہین اجالا ابھی افق کی سرحدوں سے کچھ پرے ہوتا کہ شیر دل کے خاکستری پروں میں اضطراب کی لہریں بے چین ہونے لگتیں۔ پر بھی تو اس کے ایک شاہکار ہی تھے، کسی خطاط کی مصور انگلیوں کی طرح مخروطی اور طرح دار۔ پنجرے کی جالی کھلتے ہی جیسے اسے رفعتیں پکارنے لگتیں اور فضاؤں کے بلاوے آنے لگتے اور وہ چین کی نازک پنکھیوں کے مورچھل کی طرح سرمئی فضا میں اپنے سفید اور خاکستری پروں سے کسی صادقین کی طرح موہوم آیات تحریر کرنے لگتا۔ روشنیوں اور رنگوں سے عبارت آیات۔ کہتے ہیں کہ وجود کی روح اس کے کرم ہوتے ہیں اور شیر دل کے نرم و نازک وجود کی روح اس کی پرواز تھی۔ ایک بسیط اور ہموار پرواز۔ فضاؤں کے سینے پر کسی شاعر کے تخیل کی طرح تیرتی ہوئی پرواز، جھیل کے نیلے پرسکون پانیوں کی طرح ہلکورے لیتی ہوئی، درویش کے رقص کی طرح وجد میں گھومتی ہوئی، مجذوب کی طرح مست اور بے خود پرواز۔۔۔ وہ فضاؤں میں نکلتا تو کائنات کی پہنائیاں اس کی ہمسفر ہو جاتیں۔۔۔ اور اوپر۔۔۔ اور اوپر۔۔۔ اور اس کی پرواز کے دائروں کا سفر وقت کی طرح بلند تر ہوتا چلا جاتا، زمین کا گولا مزید گول ہوتے ہوئے اپنے دلکشی اور دلآویزی کے سمندر لٹا دیتا اور تلی گانی والا، سرمے کی آنکھ والا، چمکتی گردن والا بانکا آسمان کے پراسرار سناٹوں میں گم ہو جاتا۔ اور یہ تو سورج ہی جانتا تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے اس مسافر کی زمین پر واپسی نہیں ہوگی۔

اور سورج شاہ خود بھی تو بانکا سجیلا ہی تھا۔ لمبی آنکھ، گھنگھریالے بال کھڑی ناک، پتلے ہونٹ اور قدرے لمبا چہرہ جس پر ہلکی سی کترواں داڑھی بہت ہی بھلی لگتی تھی۔ بالوں کو کنگھی کر کے سر سے چپکا تا تو گردن پر حاتم طائی کی طرح ایک گھنگھریالی جھالر بن جاتی۔ ہاتھ میں موٹے پتھروں کی انگوٹھیاں اور منہ میں گولڈ لیف سگرٹ۔ دکانوں کے سائن بورڈ لکھنے کا کام کرتا تھا لیکن کمال کا خطاط تھا کہ سائن بورڈ لکھنے میں ہی زندگی کا سارا حسن نچوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ ایک عجیب آوارہ جمالیات کا رنگ تھا جو ہر اس وجود میں رچ جاتا جو سورج شاہ سے وابستہ ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اس کے جوتے، اس کی چال ڈھال اس کا رنگ روپ، اس کی گفتگو، اس کا لہجہ اور اس کے کبوتر۔ ہاں اس کے کبوتر بھی تو بھی اس کے انوکھے مزاج کی طرح خوبصورت بانکے اور آوارہ تھے۔ وہ ان سے عشق کرتا تھا۔ ان کی ہر ادا سے۔ ان کے رنگ و روپ سے، ان کے بیٹھنیا ور چلنے سے ان کی آواز سے، ہر وہ چیز، جو سورج شاہ کیکبوتروں سے تعلق رکھتی تھی، سورج شاہ کی محبوب تھی، یہاں تک کہ ان کا پنجرہ بھی جسے وہ نت نئے انداز میں سجاتا تھا اور ان کا دانہ بھی جو بنوانے کے لیے چکی والے کو ہر بار نئے سرے سے ہدایات دی جاتی تھیں۔ سورج شاہ کے سارے کبوتر سفید تھے۔ تلی گانی والے، کالی آنکھ والے اور گول ابھرے ہوئے سینے والے۔ اس کے کبوتر قدرت کی صناعی کا ایک شاہکار تھے اور جب کوئی کبوتر پیٹھ کیپر پھلا کر گردن اور سینے کا غبارہ بنا کر غٹرغوں کی گردان پر رقص کرتا اور دم کے مور پنکھ سے فرش پر جاروب کشی کرتے ہوئے گرجتا تو سورج شاہ کی دلچسپی دیکھنے والی ہوتی۔ کبوتریوں کی مستانہ چال اور ناز و ادا کو وہ عشوے اور غمزے کہا کرتا تھا۔ اسے کبوتروں میں وہی حسن نظر آتا جو اس کے سفید ذوالجناح میں تھا جسے وہ محرم کی دسویں کو سجایا کرتا تھا۔

سورج شاہ کے سارے کبوتر سفید تھے لیکن چھ ماہ پہلے ایک پٹھا ایسا نکلا تھا کہ تمام سفید وجود کے ساتھ اس کیشہ پر خاکستری رنگت کے تھے۔ ایسا کبوتروں میں بہت کم ہوا کرتا ہے۔ سورج شاہ کو یہ پٹھا بہت پسند تھا۔ اپنی شکل وصورت اور رنگ و روپ کے علاوہ اس کی اڑان کمال تھی۔ منہ اندھیرے نکلتا اور شام ڈھلے واپس اترتا۔ کبھی کبھی تو سورج شاہ کو بتی جلا کر اس کی رہنمائی کرنا پڑتی کہ سیدھا اپنی چھت پر اترے۔ شام کے اندھیرے میں جب اسے یہ شیر دل پٹھا آسمان میں نظر نہ آتا تو اسے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ یہ بڑا دلیر پٹھا تھا اور سورج شاہ اس کی دلیری سے ہی ڈرتا تھا۔ وہ آسمانوں میں رہنے والی بلاؤں کو جانتا تھا۔ اور اسے علم تھا کہ یہ بلائیں اندھیروں میں کتنی خوفناک ہو جایا کرتی ہیں۔ لیکن یہ پٹھا تو کچھ اور ہی تھا۔ اسی لیے تو اس کا نام شیر دل تھا۔

شیر دل کو بھی اونچی فضاؤں سے شاہ جی کی بے چینی نظر آتی رہتی تھی۔ آسمان میں اونچائی کی ایک حد ہے جہاں سے اوپر جا کر پرندے اہلِ زمین کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ لیکن پرندوں کی تیز نظر زمین تک پہنچتی رہتی ہے۔ اس حد سے اوپر وہی اڑتا ہے جس میں ہواؤں کو تسخیر کرنے کا دم ہوتا ہے۔ اس اونچے مقام پر ہر طرف خطرے ہوتے ہیں اور شیر دل کے لیے سب سے بڑا خطرہ تڑمتے باز تھے۔ یہ ترمتے باز کبوتر کے ڈیل ڈول سے ذرا ہی بڑے ہوتے ہیں لیکن اپنی طاقت، پھرتی اور چستی کے علاوہ اپنے خونخوار مزاج کی وجہ سے کبوتروں کے لیے عذاب بن جاتے ہیں۔ ان کی چونچ اور پنجے کبوتروں کو بے بس کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ شیر دل کو ان ترمتے بازوں کا بارہا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ عمیق اندھیروں سے تیر کی طرح نکلتے تھے اور اگر کبوتر ناتجربہ کار یا ذرا سا بھی کمزور ہوتا تو چشمِ زدن میں اس کے کٹے پھٹے جسم کے چیتھڑے فضاؤں میں بکھر جاتے۔ لیکن شیر دل ان بازوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زمین کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے سورج کی

روشنی اور زمین کے سایوں کی سرحد پر ان ترمتوں کی بینائی جواب دے جاتی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی اسے محسوس ہوتا کہ ترمتا حملہ آور ہے، وہ ہوائی کی طرح جھکاوا دیتا اور پھرکی کی طرح گھوم کر ایسا کاوا کاٹتا کہ ترمتا گوپھن کے پتھر کی طرح دور خلاؤں میں نکلتا چلا جاتا اور اس کی واپسی تک شیر دل کے پاس روشنیوں اور سایوں کی سنگم پر اپنا خاکستری وجود چھپانے کی بہت مہلت ہوتی۔

سورج شاہ کو سائن بورڈ لکھنے کا ایسا کام ملا جو پولیس والوں کے لیے رات کے اندھیرے میں چمکنے والی روشنائی سے لکھنے کا کام تھا۔ یہ روشنائی بڑی خوبصورت تھی۔ رات کو اس پر ہلکی سی روشنی پڑتی تو چمک اٹھتی تھی۔ سورج شاہ کے لیے تو یہ ایک نعمت تھی۔ وہ اس روشنائی کا ایک ڈبا گھر لیتا آیا اور کبوتروں کے پنجروں کے کناروں پر یہ رنگ اس طرح لگایا کہ روشنی پڑتے ہی چراغاں سا ہو جاتا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ کبوتروں کے اندھیروں میں بھٹکنے کا امکان بہت کم ہو گیا تھا۔ چند دن میں کبوتر اپنے پنجرے کے اس نئے نقشے سے مانوس ہو گئے اور بڑے آسانی سے اسے تلاش کرنے لگے۔ سورج شاہ اپنے کبوتروں کے پروں کے نیچے سبز رنگ لگایا کرتا تھا، خاص طور پر ان کبوتروں کے پروں کے نیچے جنھیں مقابلے میں اڑانا مقصود ہوتا۔ اس بار اس نے شیر دل کو بھی مقابلے کے لیے منتخب کیا اور دوسرے دس کبوتروں کے سات اس کے پروں کے نیچے بھی رنگ لگا دیا لیکن اس بار سورج شاہ نے وہی چمکنے والا رنگ لگایا۔ شام کے سرمئی اجالے، چمکتا ہوا پنجرہ اور اونچی فضاؤں سے اترتے ہوئے کبوتروں کے پروں کے نیچے چمکتا ہوا رنگ۔ شاہ جی کا ذوقِ جمال واقعی آوارہ تھا۔

فجر کی سرمئی روشنی میں پنجرے کا دروازہ کھلا اور شیر دل ہواؤں کے بکھرتے ہوئے سمندر میں ایسے تیرنے لگا جیسے کسی جہاز کے بادبان کھل گئے ہوں۔ آج اسے اپنے پروں میں ایک نئی طاقت محسوس ہو رہی تھی۔ شاید شاہ جی کے نسخے کا اثر تھا جو بازی والے کبوتروں کے لیے خصوصی طور پر تیار ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ اہل زمین پر سورج طلوع ہوتا، شیر دل آسمان کی پراسرار وسعتوں میں گم ہو چکا تھا۔ دور کہیں گول زمین کے کنارے پر سنہری کرنوں کا جنگل دہک رہا تھا، بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے تھے جنھیں سورج نے اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا اور خنک ہوا کے جھونکے شیر دل کے پروں کو سہلا رہے تھے۔ یہ رفعتیں اس کی تھیں۔ وہ ان پہنائیوں کا شہزادہ تھا۔ وہ اس گرد باد میں کسی حاتم کی طرح منزلیں مارتا تھا۔ وہ سورج سے سرگوشیاں کرتا تھا اور ستارے اس کی مستانی پرواز کے شیدائی تھے۔ یہ دن اس کا تھا اور اس نے بڑی وارفتگی سے اسے طے کیا۔ صبح سے شام تک اس کا سبک وجود ہواؤں کے اس پرسکون سمندر میں کسی کشتی کی طرح ہلکورے کھاتا رہا۔ سورج کا نصف دائرہ تمام ہوا تو واپسی کے احساس نے مہمیز دی اور شیر دل نے ایک طویل غوطہ لگایا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ آج تو مستی اور سرشاری میں اس نے شام کو رات کر دیا تھا۔ شاہ جی کے نسخے لاجواب تھے۔ بازی جیتنا تو جیسے کھیل تھا، لیکن آج اندھیرے کی چادر کچھ زیادہ ہی پھیل چکی تھی۔ ابھی وہ لمبی ڈبکی سے پوری طرح ابھرا بھی نہیں تھا کہ آسمان کی بلندیوں سے ترمتا باز کسی بگولے طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی غضبناک آنکھوں میں لہو کی پیاس تھی اور اس کے بھوکے پنجے تازہ ماس کی طلب میں اس کے جسم سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ شیر دل کی ساری حسیات اس کے پروں میں سمٹ گئیں اور اس نے بجلی کے کوندے کی طرح لہرا کر فضا کی چادر کاٹی اور خرگوش کی طرح سرک لگا کر اندھیرے کی دیوار میں گم ہو گیا۔ شکاری اپنی رو میں کہیں کا کہیں جا پڑا۔ کیا مجال تھی اس کی کہ شیر دل کے سائے کو بھی چھو پاتا۔ شیر دل کا دل چاہا کہ غرور سے ہواؤں میں قلابازیاں لگائے لیکن جلدی اترنے کا گہرا احساس اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ اس نے پر جوڑے اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح زمیں کا رخ کیا۔ یہ ہنر کمال تھا۔ فاصلے ایک جھٹکے میں سمٹتے چلے گئے، مگر یہ کیا؟ شکاری ترمتا تو اس کے پیچھے تھا۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار جھکاوا کھانے کے بعد یہ باز واپس تو نہیں پلٹتے تھے۔ اجالے اور اندھیرے کی سرحد پر انھیں شکار کہاں نظر آتا تھا۔ شیر دل نے پھر اپنے تھکے ہوئے جسم کو مروڑا دیا اور باز اس گھومتے ہوئے لٹو کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ ایک موقع اور مل گیا تھا جو ملا نہیں کرتا۔ اب اور گنجائش نہیں تھی۔ شیر دل نے پروں کو زوردار جھٹکے دے کر پانی میں تیرتے ہوئے مینڈک کی طرح فضا میں تیز چھلانگیں لگائیں اور باز سے بہت دور نکل گیا۔ جیسے ہی باز نظروں سے اوجھل ہوا، وہ انتہائی بدحواسی میں گولی کی طرح زمین کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ فاصلہ بہت کم ہو چکا تھا اور اسے دور زمین پر اپنے پنجرے کا چمکتا ہوا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ سورج شاہ بھی آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اوپر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا سگرٹ سلگ رہا تھا اور انگوٹھی کا پتھر فضاؤں سے بھی چمکتا نظر آ رہا تھا۔ شیر دل کی نظر پنجرے پر تھی اور پر زوردار جھٹکے لے رہے تھے۔ فضاؤں میں عجیب منظر تھا۔ روشنی کی لکیریں شنجرف کی سطروں کی طرح آسمان کے اوراق پر رقم ہو رہی تھیں۔ پروں کے زوردار جھٹکوں سے یوں لگ رہا تھا جیسے شہاب ثاقب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہو۔ سورج شاہ یہ منظر دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ کلمہ تحسین بلند ہوا اور یہی لمحہ تھا جب شکاری ترمتا شیر دل سے ٹکرایا۔ قاتل پنجے اس کے تھکے ہوئے وجود میں دھنستے چلے گئے اور پروں کا غبار فضا میں ایسے پھیلا جیسے کسی نے انار چھوڑ دیا ہو۔ شیر دل کا وجود ترمتے کے ساتھ کہیں دور آسمان میں گم ہوتا چلا گیا اور زمین پڑے کھڑے ہوئے سورج شاہ نے عجیب نظارا دیکھا۔ شہاب ثاقب ایسے بکھرا جیسے پھلجھڑی چھوٹی ہو اور زمین کی روشنیوں میں پروں پر لگا ہوا چمکتا رنگ ہر طرف بکھر گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ستارے آہستہ آہستہ زمین پر اتر رہے ہوں۔

افسانہ

ننھے ہاتھ

ایوب صابر

جون کی گرمی میں جب سورج سوا نیزے پر آیا تو دھرتی پیتل بن کر تندور کی طرح دہکنے لگی ۔ اِس قیامت خیز گرمی میں سانچے کے اندر گیلی مٹی ڈال کر اِس سے اینٹ بنانا دراصل اینٹ سے اینٹ بجانے کے مترادف تھا۔ راشد ننگے سر اور ننگے پاؤں اِس کارِ مشقت میں لگا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اِس گیلی مٹی سے اینٹ بن کر بھٹے میں پکے گی تو اُس کے گھر ہنڈیا چولھے پر چڑھے گی۔ اُس کی بیمار ماں ساجدہ کی دوا آئے گی، اُس کی چھوٹی بہن عذرا کی اسکول کی پڑھائی جاری رہ سکے گی۔ راشد کا باپ انور علی ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا۔ شوہر کو نشے کی لت نے گھیر رکھا تھا شاید یہی وجہ ساجدہ کے بدن میں زہر بن کر سرایت کر گئی اور اُس نے کھٹیا پکڑ لی تھی۔ انور علی کہنے کو تو گھر کا سربراہ لیکن حقیقت میں وہ گھر پر بوجھ بن گیا تھا۔

سورج کے صبح کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی راشد گھر سے نکل جاتا ۔ اُس کی بہن عذرا سُرخ اور سفید رنگ کے پونے میں ایک سوکھی روٹی باندھ کر دے دیتی ،جس کے درمیان آم کے اچار کی ایک قاش رکھی ہوتی جو اِس 12 سالہ مزدور کا من و سلویٰ تھا۔ کام کرتے ہوئے نہ صرف راشد کا بدن دھات نما ہو گیا بلکہ سینے میں دھڑکتا دل بھی خواہشات سے عاری ہو چکا تھا۔

راشد شام کو تھک ہار کر لوٹتا تو گھر کی ویرانی اُس کا استقبال کرتی ۔ گھر جو ہر انسان کے لئے راحت اور سکون کی علامت ہوتا ہے، راشد کے لئے گھر کوئی خوشگوار احساس نہیں تھا۔ وہ جونہی گھر میں داخل ہوتا تو ماں کی مستقل مزاج کھانسی الارم کی طرح سنائی دیتی ۔

کچی مٹی کی دیواروں سے بنے دو کمرے اپنی حالتِ زار پر ماتم کناں نظر آتے ۔ بڑا کمرہ سونے کے لئے استعمال ہوتا تھا اور چھوٹے سے رسوئی کا کام لیا جاتا ۔ کمروں میں اگر زور سے بات کی جائے تو اپنی آواز کی گونج سنائی دیتی کیونکہ اندر کوئی ایسی خاص شے نہیں جس سے ٹکرا کر آواز ذرا مدہم ہو جائے ۔ بڑے کمرے میں تین چارپائیاں اور ایک پرانا صندوق پڑا تھا ،کمرے میں روشنی کے لئے دروازے کے علاوہ چھت پر ایک مگ بنا ہوا تھا۔ اِس مگ پر بارش کے وقت ایک کونڈا الٹا کر کے رکھ دیا جاتا وگرنہ یہ ہوا اور روشنی کا کام دیتا اور اگر چھت پر گندم خشک کرنے کے لئے ڈالی ہو تو اُسے اٹھا کر لانے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی بلکہ اِس مگ سے اندر گرا دی جاتی ۔ چھوٹے کمرے میں ایک چکی اور کونے میں چولھے کے قریب دو کیتلیاں رکھی ہوئی تھیں جو چولھے کا کالا دھواں لگنے سے سیاہ ہو چکی تھیں۔ صحن کے ایک کونے میں گھڑونچی پر رکھا گھڑا اکثر پانی کو ترستا تھا۔ ننھی عذرا اپنی مقدور بھر کوشش کرتی کہ گھر اور برتن صاف رکھے لیکن ابھی وہ اتنی سلیقہ مند نہیں ہوئی کہ ہر ذمہ داری احسن طریقے سے انجام دے سکے۔ چھوٹے سے صحن میں ایک لکڑی کی سیڑھی رکھی تھی جس کے ڈنڈے پکڑ کر عذرا اکثر چھت پر چڑھ جاتی اور ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہوئے سوچتی کہ ہمارے مقدر کا سورج بھی غروب ہو گیا۔

راشد صبح جب گھر سے نکلتا تو اُس کے ہم عمر بچے نیلی پیلی وردیوں میں ملبوس بستے کاندھے پر لٹکائے اسکول کی طرف جا رہے ہوتے ۔ ہر بچے کے بستے میں کتابوں کے علاوہ ایک عدد ٹفن بھی موجود ہوتا جس میں اُن کی ماؤں نے دیسی گھی کا پراٹھا رکھا ہوتا تھا۔ یہ بچے اسکول جاتے ہوئے اپنا جیب خرچ ایک دوسرے کو دکھا رہے ہوتے ۔ راشد کی جیب بے ایمان کی نیت کی طرح خالی رہتی ۔ اُس کی شلوار کا ایک پائنچہ ذرا اوپر اور دوسرا نیچے ہوتا۔ گلے کے تینوں بٹن کاج کا ساتھ چھوڑ کر کب کے جدا ہو چکے تھے،اب کالر کے قریب ایک بکسوا لگا کر راشد نے اپنی غربت کا بھرم باقی رکھا ہوا تھا۔

آج صبح گھر سے نکلتے وقت ماں نے کہا کہ کھانسی کا شربت ختم ہو گیا۔ بھٹے پر جاتے ہوئے راشد اِسی سوچ میں گم تھا کہ انور علی نے اُسے گھیر لیا۔ انور علی کی حالت بتا رہی تھی کہ اُس کا نشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اُس نے راشد پر پیار کا حربہ آزماتے ہوئے ملتجی انداز میں کہا۔

''راشد بیٹا ! کچھ پیسے دے دو مجھے اپنی دوا خریدنا ہے۔''

''ابا! میری جیب خالی ہے۔'' راشد نے بے بسی سے کہا۔

''تمھاری ماں بھی مجھے پیسے نہیں دیتی اور تم بھی انکار کر رہے ہو۔'' انور علی نے اصرار کیا۔

''ماں کے پاس پیسے کہاں ہوتے ہیں، جو تھوڑے بہت میں کماتا ہوں وہ گھر کا راشن یا ماں کے علاج پر خرچ ہو جاتے ہیں۔'' راشد نے حقیقت سامنے رکھ دی۔

''میں سب جانتا ہوں ، تم دونوں ماں بیٹا مجھ سے جھوٹ بولتے ہو۔'' انور علی غصے میں آ رہا تھا۔

''ابا ! آپ خود کیوں نہیں کماتے ؟'' راشد نے ترکی بترکی جواب دیا۔

''اپنی بکواس بند کرو۔'' انور علی نے راشد کو ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ اُسے اپنے معصوم بچے پر بالکل ترس نہیں آ رہا تھا۔ اُسے تو اپنے نشے کی فکر لاحق تھی جس کی وجہ سے اُس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ انور علی نے راشد کا بازو پکڑ کر اُس کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ سامنے والی جیب سے کچھ نہیں نکلا، اب قمیض کی ایک طرف والی جیب کو ٹٹولنے لگا۔ اُس کے ہاتھ ایک کاغذ آ گیا۔ انور علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے فوراً کاغذ باہر نکالا تاکہ نوٹ قبضے میں لے سکے لیکن اگلے ہی لمحے وہ مایوسی کا شکار ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک عام سا کاغذ تھا۔

''باپ کو دھوکا دینے کے لئے کاغذ جیب میں لے کر گھوم رہا ہے۔'' انور علی نے ساری خباثت راشد پر انڈیل دی۔

''یہ دوا کی پرچی ہے، آج شام بھٹے کے مالک سے کچھ ادھار لے کر ماں کی دوا لاؤں گا۔'' راشد نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

''تیری ماں کو کوئی بیماری نہیں، سب فریب ہے اُس کا۔'' انور علی مسلسل بیٹے کو گھور رہا تھا۔

''ابا! ماں کی سب سے بڑی بیماری تو آپ ہو۔'' راشد نے ہمت کر کے جواب دیا۔

''دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے، ایک تو پیسے نہیں دیتا اور اوپر سے زبان چلاتا ہے۔'' انور علی چلایا۔

اُس نے دوا کی پرچی زمین پر پھینک دی جو راشد نے اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھ لی۔

راشد بھٹے پر پہنچ کر اپنے روزمرہ کاموں میں مشغول ہو گیا۔ سب سے پہلے خشک مٹی گیلی کرنا تھی اُس کے بعد اپنے ننگے پاؤں سے اِس مٹی کو آٹے کی طرح گوندھ کر نرم کرنا تاکہ اِسے سانچے میں ڈھال کر اینٹیں بنا سکے۔ راشد کو ایسا لگتا کہ گیلی مٹی کے ساتھ وہ خود بھی سانچے میں ڈھل رہا تھا، ایک ایسا سانچہ جس میں معاشرے نے اُسے دبا کر موافق کر دیا تھا۔ وہ سارا دن شلوار کو نیفے میں گھسیڑ کر بائیں بازو کے کف سے پسینہ پونچھتا اور مشقت کرتا رہتا۔ سورج کی تپش نے اِس معصوم کے خدوخال بھی پکی مٹی کی طرح کر دیئے تھے۔ بھٹے کا منشی اپنے پلاسٹک فریم والے چشمے کو ناک پر جما کر جب اینٹوں کی کوالٹی جانچ رہا ہوتا تو اُس ظالم کو راشد کی معصومیت پر بھی ترس نہیں آتا۔

ماں کی بیماری، بہن کی پڑھائی اور باپ کے نشے کی لت نے راشد کو وقت سے پہلے جوان کر دیا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ میرا بچپن کہاں گم ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر کبھی کبھار ہی ہنسی آتی تھی۔ تب اُسے یاد آیا کہ ایک دن بھٹے پر بندر والا تماشہ دکھانے آیا تھا اور اُسے بندر کا تماشہ بہت پسند آیا۔ بندر جب روٹھی ہوئی بندریا کو منانے کے لئے ٹہل ٹہل کر سسرال جاتا تو اُس کی اکڑفوں دیکھ کر راشد کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔ کام ختم کرنے کے بعد راشد بھٹہ مالک سیٹھ جعفر کے پاس گیا جو کریم کلر کی بوسکی کی قمیض اور سفید لٹھے کی شلوار پہنے چارپائی پر بیٹھا گولڈ لیف کا سگریٹ پیتے ہوئے ریل انجن کی طرح دھویں کے مرغولے نکال رہا تھا۔ راشد نے ڈرتے ڈرتے سیٹھ جعفر سے کہا ''مجھے کچھ رقم ادھار چاہیے تاکہ ماں کی دوا خرید سکوں۔''

''ابھی تو آدھا مہینہ بھی نہیں گزرا اور تم رقم مانگنے آ کھڑے ہو۔'' سیٹھ نے اُسے جھڑک پلا دی۔

اُس نے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں عرض کیا ''اگر ماں کو دوا کی ضرورت نہ ہوتی تو میں ہرگز آپ سے پیسے نہ مانگتا۔'' سیٹھ نے کچھ سوچنے کے بعد 50 روپے کا ہرا نوٹ جیب سے نکال کر اُسے دیا اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کر دی ''اب مہینہ ختم ہونے سے پہلے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔''

''سیٹھ جی میں وعدہ کرتا ہوں کہ اِس ماہ دوبارہ ادھار نہیں مانگوں گا۔'' راشد نے بے بسی سے کہا۔

راشد جلدی جلدی گاؤں کے ڈسپنسر کے کلینک پر ماں کی دوا لینے آ گیا۔ ڈسپنسر نے کھانسی کا شربت اور درد کی گولیاں دے دیں اور مزید تاکید کی ''اپنی ماں کو شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ، تمھاری ماں ٹی بی کی مریضہ ہے اور اُس کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔'' یہاں تو دو وقت روٹی کے لالے پڑے تھے، وہ ماں کو علاج کے غرض سے شہر کیسے لے جاتا۔ اُس کا باپ انور علی گھر کی ہر ذمہ داری سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ دن بھر نشے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا اور جب نشہ مل جاتا تو نشے میں دُھت ہو کر کہیں بھی زمین پر سو جاتا تھا۔

راشد گھر آیا تو دروازے سے ہی لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آج پھر انور علی نے اُس کی بیمار ماں پر تشدد کیا تھا جو بستر پر پڑی کراہ رہی تھی۔ نشے کی لت انسان کو ذلالت کے کس گڑھے میں پھینک دیتی ہے۔ انور علی اپنی شریکِ حیات اور دکھ سکھ کی ساتھی پر آئے روز ظلم وستم کے پہاڑ توڑتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ساجدہ بیٹے کی کمائی سے کچھ رقم بچا کے چھپا کر رکھتی ہوگی لیکن اُسے نہیں دیتی۔ جب انور علی اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھاتا تو اُس کی معصوم بیٹی عذرا سہم کر رسوئی میں جا کے چھپ جاتی۔

راشد کو دیکھ کر انور علی کا ہاتھ رک گیا۔ راشد نے اپنی ماں کو کراہتے ہوئے دیکھا تو اُس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ اُس کا دل چاہا کہ ایسے سنگدل باپ کا گلا دبا دے جو اُس کی بے قصور بیمار ماں پر آئے روز ہاتھ اٹھاتا تھا۔ انور علی خود بھی غصے کی حالت میں پیاسے

جانور کی طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ سرمست ہاتھی کی طرح پاؤں اِدھر اُدھر رکھتا ہوا باہر نکل گیا، نشے نے اُسے اندر سے ڈھول کی طرح خالی کر دیا تھا۔ انور علی کے باہر جاتے ہی عذرا بھی بھائی کی آواز سن کر رسوئی سے ڈرتے ہوئے باہر نکل آئی۔ دونوں بہن بھائی سسکتی ہوئی ماں سے چمٹ گئے۔ بچوں کو سینے سے لگا کر ساجدہ کی سسکیاں اِس طرح تھم گئیں جیسے ایک بچے کو ماں اپنے سینے سے لگا لے تو بچہ بہل جاتا ہے۔

راشد نے دیکھا کہ اُس کی ماں کے بازوؤں پر مار سے گھومڑ بن گئے تھے۔ وہ اپنی ماں کے دوپٹے کا ایک پلو گیند کی طرح گول کر کے ننھے ہاتھوں سے منہ پر رکھ کر پہلے اپنے سانس سے گرم کرتا، اس کے بعد جلدی سے ماں کے بازوؤں پر ٹکور کرتا تاکہ چوٹوں میں ٹیس کم ہو جائے، راشد کو علم تھا کہ جب اُس کا باپ اُسے مارتا تھا تو اُس کی ماں اِسی طرح اپنے دوپٹے سے ٹکور کرتی تھی۔

انور علی کو اب یقین آ گیا کہ مجھے گھر سے کوئی مالی امداد نہیں ملے گی۔ اِس لئے اُس نے دوسرے ذرائع پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے چھوٹی موٹی چوریاں کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کسی کے نلکے کا ہینڈل یا کھیتوں میں لگے ٹیوب ویل کے انجن کا کوئی پرزہ بیچ کر وہ اپنا نشہ پورا کرتا۔ راشد کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا جب لوگ اُسے چور کا بیٹا کہہ کر پکارتے۔ وہ اپنے خون پسینے کو ایک کر کے روزی کماتا تھا اس کے باوجود لوگ اُسے چور کی اولاد کہتے تھے۔ چور کا لفظ اُس کے ماتھے کا کلنک بن گیا۔ کبھی کبھی وہ اکیلا بیٹھ کر اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر روتا رہتا، اُس کے پاس نہ کوئی اُس کے آنسو پونچھنے والا اور نہ کوئی درد بانٹنے والا ہوتا۔

انور علی کا اب ہاتھ کُھل گیا تھا۔ وہ چوری میں کاروبار کی طرح ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اُس نے گاؤں کے ایک آدمی کی بائیسکل چوری کر کے بیچ دی۔ اُس آدمی نے تھانے جا کر انور علی کے خلاف چوری کی ایف آئی آر درج کرا دی۔ پولیس نے انور علی کو نشے بازوں کے ڈیرے سے گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا۔

ساجدہ کو جب انور علی کے اِس کارنامے کی اطلاع ملی تو وہ اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھی تاسف کا اظہار کرنے لگی، وہ بے چاری اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

''اماں! میں بھائی کو بھٹے پر یہ خبر سنا آؤں۔'' عذرا نے ماں سے کہا۔

ماں نے منع کرتے ہوئے کہا ''یہ کون سی خوشخبری ہے جو تم بھائی کو جلدی سنانا چاہتی ہو، تیرے باپ کی خبر بھٹے تک پہنچ جائے گی۔'' عذرا افسوس سے ہاتھ مل رہی تھی کہ ہمارے گھر میں پہلے ہی کیا کم مشکلات تھیں جو اُس کا باپ چوری کے مقدمے میں قید ہو گیا۔ راشد شام کو گھر آیا تو اُس کے قدموں کی لغزش بتا رہی تھی کہ اُسے واقعے کا علم ہو چکا تھا۔

ساجدہ روز بروز موت کی دہلیز پر جا رہی تھی۔ اُس کا جسم ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔ منہ سے دانت باہر جھانک رہے تھے۔ ہاتھوں پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں تھی صرف اُبھری ہوئی نسوں کا ایک جال سا نظر آتا تھا۔ وہ بھوک افلاس اور بیماری کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے تھک چکی تھی۔ راشد ہر وقت سوچ میں گم رہنے لگا تھا۔ اُس کے چہرے پر ذہنی تناؤ کی وجہ سے سختی نظر آنے لگی۔ وہ اپنی طبعی عمر سے کئی سال بڑا نظر آنے لگا تھا۔

ایک طوفانی رات میں جب موسم اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ مسلط تھا۔ باہر ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ دیکھائی نہ دے، بادل گرجنے اور بجلی کڑکنے کی آوازیں زور سے سنائی دے رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش سے گھر کی چھت ٹپک رہی تھی۔ آندھی کا اِس قدر زور تھا یوں محسوس ہو رہا تھا کوئی زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ جب آسمانی بجلی چمکتی تو اُس کی روشنی اندر تک آتی۔ آج ساجدہ کی طبیعت بھی سنبھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی، کھانسی کے ایسے دورے پڑ رہے تھے کہ سانس بحال ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ دونوں بچے سہمے ہوئے ماں کی چارپائی کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ راشد سوچ رہا تھا کہ کاش آج اُس کا باپ گھر ہوتا تو ماں کی بیماری میں کوئی وسیلہ کر سکتا تھا۔ بارش نے آج نہ تھمنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ ساجدہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اچانک ہوا نے اِس زور کا دھکا دیا کہ دروازے کی کنڈی کُھل گئی اور دونوں پٹ ایک جھٹکے سے کُھل گئے۔ ہوا اِس زور کی تھی کہ طاق میں رکھا چراغ گُل ہو گیا۔ راشد اور عذرا نے اٹھ کر پوری طاقت سے دبا کر دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔ عذرا نے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر ماچس تلاش کی اور دوبارہ چراغ روشن کیا۔ کمرے میں روشنی ہوئی تو دونوں نے دیکھا کہ ساجدہ کی زندگی کا چراغ گُل ہو رہا تھا۔ وہ موت کی دہلیز پر کھڑی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ بالآخر موت کی ہچکی آئی اور اُس کی روح جسم کی قید سے آزاد ہو گئی۔ وہ دنیا کی ہر ایک پریشانی سے آزاد ہو چکی تھی۔ دونوں بچے ماں ماں کی آوازیں لگا کر اکیلے ہی رو رہے تھے۔

صبح ہوئی تو بارش کا زور تھم چکا تھا۔ آسمان صاف ہو گیا تھا۔ دونوں بہن بھائی کے رونے کی آوازیں سن کر پڑوسی آئے تو دیکھا کہ ساجدہ اپنے آخری سفر پر جا چکی تھی۔ جب ساجدہ کا جنازہ اٹھا تو اُس کی چارپائی کو کندھا دینے کے لئے اُس کا سرتاج موجود نہیں تھا۔ وہ جیل میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہا تھا۔ راشد نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ماں کو قبر کے سانچے میں اتار دیا۔ وہ اپنے آنسوؤں سے ماں کی قبر کی مٹی گیلی کر رہا تھا۔

روڈٹو کافرستان

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریاست دیر کے پہاڑوں پر پرندے بے خوف چہچہاتے تھے۔ مرغزار لہلہاتے تھے۔ اپر دیر اور لوئر دیر میں امن ہی امن تھا جیسے سمندر بہت کچھ چھپاتے ہیں مگر اچھال کر بہت کچھ ظاہر بھی کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ان حسین نظاروں نے بہت کچھ چھپایا ہوا تھا۔ مگر حال ہی میں ہمارا جرمِ ضعیفی ان علاقوں میں بدامنی اور وحشت و بربریت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میں یہی سوچتا ہوا دیر کے مین بازار میں جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ہمارے علاقہ کے میڈیکل اسٹورز یونین کے کچھ دوست بھی تھے۔ ہمارا ارادہ لواری ٹاپ کا عظیم و بلند پہاڑ عبور کر کے چترال اور پھر کافرستان جانے کا تھا۔

دیر کے مین بازار میں بعض لوگ جاپانی پھل سے ملتا جلتا فروٹ بیچ رہے تھے جسے وہ 'فارسی من' یا 'پارسی من' کہتے تھے اس کے بیج عام کالے ملوک سے کوئی پانچ گنا بڑے تھے۔ نہایت شیریں پھل ہونے کے باوجود یہ جاپانی پھل کی طرح منہ کو خشک نہیں کرتا تھا اور کچا بھی ذائقے سے بھرپور تھا۔ میرے دوست کہنے لگے کہ عموماً کچے پھل ذائقے والے اور میٹھے نہیں ہوتے۔ پک جائیں تو شیریں ہو جاتے ہیں۔ اولاد ایک مختلف میوہ ہے جو کچا تو میٹھا ہوتا ہے پک جائے تو عموماً کڑوا لگنے لگتا ہے یا کڑوا بن جاتا ہے۔ بازار میں پھرتے پھراتے ڈرائی فروٹ کی مارکیٹ گئے وہاں تاجر تجارتی پیمانے اخروٹ، چلغوزے اور بادام کی گریاں نکال کر ایکسپورٹ کر رہے تھے۔ ریٹ پوچھا تو دوکاندار مسکرائے لہجے سے پہچان گئے کہ پنجاب سے آئے ہیں۔ انہوں نے محبت سے ڈرائی فروٹ کھلایا اور پیسے بھی نہ لیے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مہمان نوازی ہمارے شمالی علاقوں کی صفت ہے مگر افسوس کہ اس جنت نظیر خطے کو طالبان کا سیلاب اپنی لہر میں اس کی ساری خوشیوں روشنیوں اور نظاروں سمیت بہا لے گیا۔ ظاہر ہے سیلاب کا نہ کوئی رُخ ہوتا ہے نہ سمت اور نہ ہی اسے موڑا جا سکتا ہے۔

کچھ دیر بعد ہم نے لاؤ لشکر سمیت یعنی اپنے سامان کے ساتھ ایک ڈالے کو شرفِ باریابی بخشا جو چترال جانے کی نوید سنا رہا تھا۔ جستجو بھی تو پیاس ہی کی ایک قسم ہے اور ان دیکھی دنیاؤں کو دیکھنے کی جستجو مجھے کافرستان لے جا رہی تھی۔ مجھے الرجی ہو جاتی ہے اس لیے ساتھیوں نے اگلے بند کیبن میں مجھے بٹھایا اور خود پچھلے حصے میں بیٹھ گئے اس طرح کہ "حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے لیٹ گئے"

لواری ٹاپ کے دامن میں پہنچے تو ہریالی کے بیچ ایک پن چکی نظر آئی جس کے مہیب پنکھے جیسے پر دور سے بہت بھلے لگتے تھے۔ بارہ ہزار فٹ بلند لواری ٹاپ کو عبور کریں تو سامنے ہی ایک چھوٹا سا ٹاپ دکھائی دیتا ہے اسے زیارت کہتے ہیں۔ ہمارا مختصر سا قافلہ یہاں کھڑا ہو گیا۔ یہاں پر موجود اکلوتے ہوٹل والے کو ہم نے کھانا لانے کے لیے کہا۔ آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ہوا لواری ٹاپ زمین کی چھاتی پر خم ٹھونک کر کھڑا تھا۔ اس کے دامن میں کہیں کہیں چھاؤں والے علاقوں کی پستی میں پگھلتی ہوئی برف جو پچھلی سردیوں میں یہاں پڑی تھی۔ اب تک گہری کھائیوں میں لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے لواری ٹاپ کو مخاطب کر کے کہا بلند و بالا پہاڑوں کو پستی میں موجود بے وقعت اور بے حیثیت کھائیوں اور گھاٹیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ نہ ہوتیں تو بلند پہاڑوں کی قدر اور پہچان کسی کو نہ ہوتی۔

کھانا بہت غیر معیاری تھا۔ ڈرتے ڈرتے تھوڑا کھایا کہ کہیں فوڈ پوائزننگ ہی نہ کروا بیٹھیں۔ اس ڈالے میں میری ہماری ہم سفر تھیں۔ میری ہملٹن لاہور کے ایک نرسنگ کالج کی میٹرن تھیں جو چترال کی رہنے والی تھیں۔ سال میں ایک بار ہی وہ اپنے آبائی شہر جا سکتی تھیں۔ کیونکہ سردیوں میں تو ادھر جانے کا تصور ہی ناممکن ہوتا ہے۔ روزانہ ایک فوکر چترال سے اُڑ کر پشاور آتا ہے۔ والیِ چترال کے ذہین بیٹے اسی فوکر کے حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ وہ مختار مسعود جیسے نابغہ روزگار لکھنے والوں کے ساتھ ہی ان دنوں اکیڈیمی سے تربیت حاصل کر کے اے سی تعینات ہوئے تھے۔ انہوں نے آوازِ دوست اور سفر نصیب کے خوبصورت اوراق پر یہ تذکرہ کیا ہے۔

اب چلتے چلتے لواری ٹاپ ہمارے عقب میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ تقریباً تین گھنٹے کے سفر کے بعد پہاڑ سڑک سے دور دور ہٹنا شروع ہو گئے۔ میرے بائیں جانب بہت خوبصورت وادی تھی جس کے اوپر والے انتہائی سرے پر ایون کی بستی تھی جہاں سے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا رستہ عمودی چڑھائی چڑھتے کافرستان کی طرف جاتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ رستہ سیدھا کافرستان کی من موہنی وادی بمبوریت کی طرف جاتا ہے۔

"مگر اصل راستہ تو سیدھا ہوتا ہے اور وہ اکلوتا ہوتا ہے" میں نے جواب دیا۔ تقریباً پون گھنٹہ کی مزید

ڈرائیو کے بعد چترال شہر کے مضافات شروع ہو گئے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی بادشاہی مسجد پر نظر پڑتی ہے جو کہ مشہور بادشاہی مسجد لاہور سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ والیِ چترال نے یہ مسجد اپنی جیب سے خطیر رقم دے کر بنوائی تھی حتیٰ کہ ان کی اہلیہ نے برکت کے طور پر اپنا زیور بھی اس سلسلے میں ہدیہ کر دیا تھا اس پر شکوہ مسجد کی سیڑھیوں پر دریائے چترال کے نقرئی پانی کی شوریدہ سر لہریں آ کر سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ سبھی دوستوں نے شہر میں پھر پھرا کر آخر کار اسی بادشاہی مسجد کے قریب ٹرچمیر ویو ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ ہے دوسرے نمبر پر کے ٹو اور تیسرے نمبر پر ٹرچمیر کی برفانی سفید دلکش چوٹی ہے جو ہوٹل سے صاف نظر آتی ہے۔ سنا ہے کہ یہ ماربل کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور اس سے ملحقہ پہاڑوں سے انواع و اقسام کا ماربل کاٹ کر پورے پاکستان میں تعمیر کی غرض سے لایا جاتا ہے۔

شام ہونے کو تھی اور پھر وہی کھانے کا مسئلہ شہر کے اکثر ہوٹل بہت گندے تھے ناچار ایک ہوٹل میں خاک نشین ہوئے یہاں سے افغان بارڈر قریب ہے سردیوں میں چترال جانے والے لوگ پاکستان سے افغانستان کے راستے ہی آ سکتے ہیں یا پھر واحد ذریعہ پی آئی اے کی فوکر پرواز ہے جو روزانہ یا کبھی کبھی آتی جاتی ہے۔[1] ہوٹل میں بہت سے افغان تاجر چائے نوش کر رہے تھے ہم نے افغانی پلاؤ کھایا جس میں کشمش ڈال کر اسے مزید مزیدار بنایا جاتا ہے۔ اگلی صبح ہمارے دوستوں کا خیال تھا کہ کافروں پر چڑھائی کریں کافرستان جانے کے لیے ایک ڈالہ کرائے پر لیا حسب سابق میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا بلکہ ہم نشین ہو گیا۔ میرے ساتھ ایک اور چترالی بھی تھا شہر سے نکل کر دریائے چترال کے عظیم پُل پر سے گزرے تو منظر بہت سہانا لگا۔ اب ہم ایوان کی طرف جا رہے تھے ہو سکتا ہے یہ عیون ہو دو گھنٹے ڈرائیور چترالی زبان میں باتیں کرتا رہا مگر حرام ہے جو مجھے ایک بھی لفظ کی سمجھ آئی ہو۔

ایون سے آگے بمبوریت کی خوبصورت وادی شروع ہو گئی۔ راستہ بہت خطرناک تھا۔ جیپ کا ڈرائیور مشاق تھا جس کے سپرد ہمیں ڈالے والا کر گیا تھا اور جیپ والے نے خود کو شاید اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ بعض خطرناک موڑ تو ایسے تھے جن سے صرف اور صرف جیپ کا کچھ حصہ ہی گزر سکتا تھا معاً میں نے جیپ کا بایاں ٹائر دیکھا بالکل سڑک کے کنارے پر تھا اور سڑک بھی کیا بس ٹھیکریاں اُوپر تلے جڑی ہوئی تھیں اور نیچے اتھاہ گہرائی!

بمبوریت کی خوبصورتی بس محسوس کی جا سکتی تھی بیان نہیں ہو سکتی۔ چشمے کا پانی منرل واٹر کی طرف شفاف تھا۔ پی کر دیکھا تو ذائقہ ناقابل فراموش! ہمارے دائیں ہاتھ کافروں کا بڑا ہال تھا جس کے صدر دروازے پر لکڑی کے گھوڑوں کے سر نصب تھے۔ کافروں کا کوئی بندہ فوت ہو جائے تو اس ہال میں اس کو کئی روز رکھتے ہیں۔ شراب نوشی اور رقص کرتے ہیں۔ مقامی روایات کے مطابق اسی ہال کے بالمقابل ان کا مشہورِ زمانہ قبرستان ہے جس میں تابوت کے اندر لاش کو رکھ آتے ہیں۔ راستے میں ایک چشمہ تھا جسے عبور کر کے ہم یہ قبرستان دیکھنے گئے سالہا سال پرانی بوسیدہ ہڈیاں پرانے تابوتوں میں پڑی اب بھی نظر آ رہی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جب سکندرِ اعظم یہاں سے واپس گیا تو کچھ خاندان یہیں رہ گئے تھے۔ ان پہاڑوں میں رہ جانے والے انہی خاندانوں کی یہ اولاد ہے جو کافروں کے نام سے پہچانی جاتی ہے ان کے ہاں جس کے پاس کھیت یا دولت زیادہ ہو وہ کئی زوجین رکھ سکتا ہے یا کسی کی بیوی کو اپنا سکتا ہے۔ تین ہزار کے قریب ان لوگوں میں رائے ونڈ کی تبلیغی جماعت نے محنت کی اور اب آدھے سے زیادہ لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ جمعہ کا روز تھا اور قریبی مسجد سے اذان کی آواز بھی آ رہی تھی۔ مسلمان ہو جانے والے کچھ بچے قرآنِ کریم لے کر مسجد جا رہے تھے۔

کافرستان میں رہنے والے سبھی لوگ مطمئن اور مسرور ہیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ نہ کوئی کسی کی ملکیت ہے نہ کوئی کسی کو پاتا ہے نہ کھوتا ہے تو شب و روز کس قدر آسان ہو جائیں۔ شاید یہاں رہنے والوں کے شب و روز اسی لیے آسان ہیں۔ سڑک کے ساتھ ہی لاہور کے رہنے والے کسی صاحب کا گلیکسی ہوٹل تھا۔ ہمارا قیام یہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے میں ترکاری اور کسی پرندے کا گوشت تھا دوستوں نے اس روسٹ پرندے کو مخاطب کر کے کہا:

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

بمبوریت کی سیر کے لیے آگے بڑھے تو اونچے اونچے گھر نظر آئے ظاہر ہے کہ سردیوں میں یہاں دس دس فٹ برف پڑتی ہے تو گھر بھی ویسے ہی ہوں گے۔ ایک خوبصورت بچی کافرستان کے روایتی زیورات پہنے جا رہی تھی میں نے کہا تمہاری فوٹو کھینچنا چاہتا ہوں

۱- اس وقت تک لواری ٹنل نہیں بنی تھی جو پرویز مشرف دور میں تعمیر ہوئی۔ اب چترال کے لوگ آزادانہ وہاں آ جا سکتے ہیں۔

اس کے پیسے بھی دوں گا۔ مگر اس نے فوٹو اُتروانے سے انکار کرتے ہوئے کہا ''مسلمان جھوٹ بولتے ہیں'' ظاہر ہے کہ ہمارے بھائیوں کا وہاں جا کر ان کے ساتھ رویہ صحیح نہیں ہوتا جس کی وجہ سے دین اسلام پر آنچ آتی ہے۔ سامنے والے اونچے گھر میں ایک مقامی لڑکا بانسری پر دل کے تار چھیڑنے والی دھن سنا رہا تھا۔ پاس ہی کچھ لوگ کھڑے تھے۔ پتہ چلا کہ محکمہ صحت سے تعلق ہے اور کافرستان میں بنیادی مرکز صحت کواپ گریڈ کرنے آئے ہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے محکمہ کی رسائی یہاں تک بھی ہے۔ یہاں سے آگے گئے تو کچے اخروٹ، ناشپاتیاں اور خوبانیاں خود توڑ کر کھائیں جو بہت ہی شیریں تھیں۔ بمبوریت کی یہ مین روڈ آگے ایک جھیل تک جاتی ہے۔ ہزاروں فٹ بلندی پر یہ جھیل قدرت کا معجزہ ہے سامنے سرسبز پہاڑ تھے۔ ان کی چوٹیاں سرخ پوٹھوہار زمین کی طرح تھیں دامن سرسبز تھے۔ یہ کافرستان کی دوسری وادی رنبیر ہے اور اس کے ساتھ بریر کی وادی ہے انہی وادیوں میں گھومتے دو روز بعد واپس آئے تو کافرستان کی خواتین بھی ہمارے ساتھ جیپ میں سوار تھیں۔ پنجاب میں مشہور ہے کہ ان عورتوں کا رنگ اتنا صاف ہوتا ہے کہ پانی پئیں تو گلے سے اُترتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں بکھری ہوئی خوبصورتی اس بات کی واقعی غمازی کرتی تھی جاتے جاتے پھر چشمے کا پانی نوش جاں کیا وہاں گرے ہوئے عجیب وغریب پہاڑی پھل بھی کھائے جو بظاہر کھجور کی طرح تھے مگر اندر سے قالین کی طرح بور والے لگتے تھے۔

اگلے روز ہماری جیپ یہاں سے دور پہاڑوں میں موجود خوبصورت قصبے گرم چشمہ جا رہی تھی کچھ جرمن سیاح بھی ہمارے ساتھ تھے۔ گرم چشمہ ایک من موہنا پہاڑی قصبہ ہے۔ اس کے مضافات میں قدرتی گرم پانی کا چشمہ ہے جہاں عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ کچھ دور اسی گرم چشمہ کے پانی سے غسل کرنے کے لیے ڈی سی چترال نے غسل خانے بھی بنوائے ہوئے ہیں۔ کل ہماری ترچمیر کی سفید اُجلی چوٹی سے جدائی تھی واپسی کے لیے پی آئی اے کے فوکر میں سوار ہوئے اور پشاور اُترے وہاں سے ریل کار اور ویگنوں میں دھکے کھاتے اپنے گاؤں پہنچے۔ سچ ہے کہ

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
''دو ویگنوں میں کٹ گئے دو ریل کار میں''

ارشد نذیر ساحل/سپین

ہم نے دو پل بھی کبھی ساتھ گزارے کب تھے
اک گماں سا تھا فقط آپ ہمارے کب تھے
یہ تو، تو تھا کہ ہمیں تیرا بھرم رکھنا پڑا
ورنہ ہم لوگ کسی اور سے ہارے کب تھے
یہ بجا ہے کہ اِدھر آ کے نہ کچھ ہاتھ آیا
اُس طرف بھی مری قسمت میں ستارے کب تھے
تیرے آنے سے مناظر ہیں سبھی رنگ بھرے
تیرے بن آنکھ کو جچتے یہ نظارے کب تھے
یہ نصیبہ تو مرے گاؤں کے لوگوں ہی کا تھا
شہر میں تیرے بھلا ہجر کے مارے کب تھے
یہ تو چھلنی ہے مرا سینہ تری باتوں سے
تیر دشمن نے مرے دل میں اُتارے کب تھے
کتنے لوگوں سے تھا دن رات تعلق اپنا
ساتھ رہتے تھے مگر یار وہ سارے کب تھے
چارہ گر جس کو سمجھتے تھے ہمیں چھوڑ گیا
ساحل اس دل کو زمانے کے سہارے کب تھے

....

تم مجھ کو سزا میری سنا کیوں نہیں دیتے
گر نقش غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے
لوٹ آنے کے اُٹھتے ہیں بگولے مرے اندر
اک بار مجھے آپ صدا کیوں نہیں دیتے
اُجڑے در و دیوار دکھاتے ہو ہمیشہ
تم بات مجھے سیدھی بتا کیوں نہیں دیتے
چُپ چاپ تمہیں دیکھتے رہنا ہے مرا جرم
محفل سے مجھے اپنی اُٹھا کیوں نہیں دیتے
معلوم زمانے کے مسائل تو ہیں ان کو
یہ لوگ محبت کی دُعا کیوں نہیں دیتے
لہروں سے گلے مل کے بھی رہتا ہے وہ پیاسا
ساحل کو سمندر سے ملا کیوں نہیں دیتے

فروغِ ادب کے لیے وقف

بہ یاد: سیدقاسم محمود
Monthly Book Digest
لاہور
بک ڈائجسٹ
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ

براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری ونثر) کمپوز کروا کے ان پیج میں ای میل کروایا کریں۔
bookdigest@hotmail.com

آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں رسالے کے حصول کیلئے سالانہ زر تعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلی ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لئے منظور شدہ
بک ڈائجسٹ
0333-4377794

سفر نامہ

ارجنٹائن-خوابوں جیسی حسین سرزمین

عامر بن علی/ جاپان

بیونس آئیرس ائیر پورٹ پر جہاز لینڈ ہوتے ہی بیشتر مسافروں نے تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ دنیا کے دیگر خطوں کے مقابلے میں لاطینی امریکہ کے باسی زیادہ جذباتی اور جذبات کے اظہار میں ذرا زیادہ دلیر اور آزاد واقع ہوئے ہیں۔ ساڑھے چار کروڑ نفوس پر مشتمل ارجنٹائن کا یہ سب سے بڑا شہر ہے اور اس ملک کا دارالحکومت بھی ہے۔ ہمارے اسلام آباد اور انڈیا کے دہلی کی طرح بیونس آئیرس بھی ایک خودمختار علاقہ ہے اور کسی صوبے کا حصہ نہیں ہے۔ گو کہ ارجنٹائن کے 23 صوبے ہیں، جن کا مجموعی رقبہ اس ملک کو دنیا کی رقبے کے اعتبار سے آٹھویں بڑی مملکت بناتا ہے۔ علاوہ ازیں رقبے کے لحاظ سے یہ ہسپانوی بولنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔

ارجنٹائن پہنچ کر پہلی خوشگوار حیرت اس وقت ہوئی جب ہوٹل کے استقبالیہ پر کھڑے نوجوان لڑکے نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہی کہا کہ آپ کی بیشا شفیع مجھے بے حد پسند ہے، کیا خوبصورت آواز میں گاتی ہے۔ حیرت کا پہلو یہ ہے کہ اس نوجوان کو سوائے ہسپانوی کے کوئی دوسری زبان نہیں آتی، اردو تو بالکل بھی نہیں۔ مگر موسیقی تو ایک عالمی زبان ہے، بول سمجھ میں نہ بھی آسکیں پھر بھی آپ لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سات سمندر پار بیٹھا یہ شخص پاکستان کے کوک سٹوڈیو میں ریکارڈ ہونے والے سیزن 9 تک ہماری موسیقی پر کان جمائے بیٹھا ہے۔ فن سے یہ لوگ پیار کرتے ہیں۔ اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو ان لوگوں نے بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں تھیٹر میں نے دنیا کے کسی اور دیس میں نہیں دیکھے۔ حالانکہ داخلے کی سب سے سستی ٹکٹ بھی پاکستانی سات ہزار روپے کی ہے، جبکہ مہنگی تو کافی زیادہ مہنگی ہے۔ شہر کے وسط میں حکومت کا قائم کردہ تھیٹر میوزیم بھی قابلِ دید ہے۔ اس میں تھیٹر کی روایت اور تاریخ کا احاطہ کرنے کے علاوہ عہد ساز ڈراموں کی تصاویر اور ملبوسات سجائے گئے ہیں۔ یہ میوزیم ایک قدیم ومعروف تھیٹر کی عمارت میں قائم کیا گیا ہے۔ شہر میں دن بھر کسی نہ کسی چوک اور چوراہے ہیں ''تانگو'' رقص ہوتا رہتا ہے، جو کہ ارجنٹائن کی ثقافتی پہچان ہے۔ بن سنور کر لڑکے لڑکیاں اس میں شریک ہوتے ہیں، بہت سارے ان میں سے پروفیشنل اور نیم پروفیشنل بھی ہوتے ہیں، مجمع اکٹھا کر کے یہ تانگو رقص پیش کرنے کے بعد اپنی موسیقی کی بنائی ہوئی سی ڈی فروخت کرتے ہیں۔ اس کی قیمت عموماً کافی یا چائے کے ایک کپ کے برابر ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جیسے مداری اور مجمع باز تماشہ دکھا کر پہلے مجمع اکٹھا کرتے ہیں اور آخر میں کوئی دوائی بیچتے ہیں۔ شاید یہی رنگارنگی ہی وجہ ہے کہ بیونس آئرس جنوبی امریکہ میں سیاحوں کی مقبول ترین منزل اور سب سے زیادہ سیاحتی آمدورفت والا شہر قرار دیا جاتا ہے۔ اس شہر میں امن وامان کی صورت حال مثالی ہے اور پھر سمندر کے ساحل نے تو اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

مقامی کرنسی پیسو ہے ایک پیسو ہمارے سات روپے کے برابر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سالہا سال تک ارجنٹائن نے ڈالر اور پیسو کو آپس میں یوں نتھی کیا ہوا تھا کہ ایک پیسو، ایک امریکی ڈالر کے برابر تھا۔ مگر چونکہ یہ تعلق مصنوعی طریقے سے جوڑا گیا تھا، اس فیصلے کی معاشی بنیادیں کمزور تھیں۔ لہذا یہ تعلق جب ٹوٹا تو اس کے انجام کے طور پر ارجنٹائن کو بہت خوفناک معاشی بحران سے گزرنا پڑا۔ پیسو کو آزاد کرنسی قرار دے دیا گیا، بعد از خرابی بسیار، آجکل ایک ڈالر میں پندرہ پیسو آجاتے ہیں۔ ارجنٹائن کی معیشت کو اگر تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو صرف ایک صدی پہلے یہ دنیا کا ساتواں امیر ترین ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس کی معاشی ترقی ہی وہ وجہ تھی کہ یہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک یورپ سے ہجرت کرنے والے تارکین وطن کی امریکہ کے بعد سب سے مقبول منزل تھا۔ یہ تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ اس ملک کی ستر (70%) فیصد آبادی ہسپانوی اور اطالوی نسل کے لوگوں کی ہے باقی ماندہ لوگ یورپ کے دیگر ممالک یا پھر دنیا کے باقی ملکوں سے آئے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ امریکہ اور آسٹریلیا وکینیڈا کی طرح تارکین وطن کا ملک ہے۔ معیشت میں گراوٹ کے باوجود یہ معاشی اعتبار سے پہلے بیس، دنیا کی مضبوط ترین معیشت رکھنے والے ممالک میں سے ایک ہے۔

برف پوش اور سرسبز پہاڑوں، ہری بھری چراگاہوں اور میدانوں کے اس دیس کی مرغوب غذا گوشت ہے۔ یہاں اعلیٰ قسم کا تازہ گوشت ارزاں نرخوں پر دستیاب ہے اور یہ گوشت اس ملک کی برآمدات کا اہم جزو بھی ہے۔ بھنا ہوا گوشت یہاں کی زندگی اور دسترخوان کا لازمی جزو ہے۔ تازہ سبزیاں، پھل اور دودھ کے علاوہ گوشت مرغوب ومقبول غذا ہے، اسی سبب سے لوگ بہت صحت مند ہیں۔ کھانے، پینے کے شوقین لوگ بہت ہیں مگر موٹاپا نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ عوام کی کھیلوں کے ساتھ رغبت ہے۔ یوں تو کبڈی سے لیکر ہاکی، ٹینس، گالف، سبھی کچھ یہاں اعلیٰ معیار کا کھیلا جاتا ہے مگر فٹبال کی مقبولیت کا احوال

تو بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک پورے اسٹیڈیم کو جو شہر کے وسط میں تھا، فٹبال کے عجائب گھر میں بدل دیا گیا ہے۔ داخلے کی ٹکٹ پانچ صد روپے ادا کر کے اندر جائیں تو دیکھیں گے کہ ارجنٹائن کے فٹ بال کی پوری تاریخ یہاں محفوظ ہے۔ سینما اسکرینیں لگی ہوئی ہیں، جن پر ہر وقت فٹ بال کے یادگار لمحوں کی فلمیں چلتی رہتی ہیں۔ میراڈونا کا گول یہ اب بھی نہیں بھولے جس نے انہیں دہائیاں قبل فٹ بال کا عالمی چیمپئن بنایا تھا۔ فٹبال میوزیم کے اردگرد ریستوران اور دوکانیں بھی فٹبال کے دیوانوں اور پروانوں کی ہیں۔ ایک ایسے ہی ریستوران میں لنچ کیلئے داخل ہوا تو پتا چلا کہ یہاں مشہور کلب کولوکولو کا قبضہ ہے۔ جان کی امان چاہتے ہیں تو ان مردوزن کے سامنے کولوکولو کے متعلق کوئی تنقیدی جملہ زبان پر مت لائیں بے حد جذباتی فضا اور مزیدار کھانا۔

ارجنٹائن کے سماج کا طائرانہ جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کی سب سے مقبول شخصیات تین ہیں، جو کہ معروف فٹ بالر میراڈونا، بائیں بازو کے انقلابی گوریلا چے گویرا اور پاپائے روم فرانسس ہیں، ان تینوں کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ ویسے تو ہالینڈ کی موجودہ ملکہ معظمہ میکسیما بھی ارجنٹائن میں پیدا ہو کر یہیں پلی بڑھی ہیں مگر ان کی مقبولیت مذکورہ شخصیات جیسی نہیں ہے۔ پوپ فرانسس کی عالمی اہمیت تو اس وجہ سے بھی ہے چونکہ وہ پہلے غیر یورپی ہیں جو ویٹی کن میں اس بلند ترین عہدے تک پہنچے ہیں، کیتھولک کلیسا کے سربراہ کی اہمیت بالخصوص لاطینی امریکہ میں کچھ زیادہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کیتھولک یہاں پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک میں ان کا تناسب اسی فیصد (80%) کے قریب ہے۔ یوں تو ایونجلیکل عیسائی مسلک شمالی وجنوبی براعظم امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا عقیدہ ہے۔ مگر ابھی تک کسی بھی ملک میں اس کے پیروکار دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں، ارجنٹائن میں ان کا تناسب نو فیصد ہے اور گیارہ فیصد لوگ لادین ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ یہاں بسنے والے یہودیوں کے برابر ہے یا پھر ان سے تھوڑے زیادہ ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان مسجد ہے جس سے ملحقہ ایک لائبریری اور اسلامک سنٹر بھی ہے۔ اس کا انتظام عرب مسلمان چلاتے ہیں۔ عالیشان مسجد کی ویرانی دیکھ کر اقبال کا وہ شعر یاد آتا ہے۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں
نے من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

لاطینی امریکہ میں سب سے زیادہ یہودی اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ دارالحکومت میں جگہ جگہ آپ کو مخصوص ٹوپی "سکل کیپ" سیاہ کوٹ پتلون اور سفید قمیض میں ملبوس یہودی نظر آتے ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک بڑا اور قدیم "سیناگاگ" ہے۔ اس معبد سے ملحقہ ایک یہودی میوزیم ہے۔ میں نے اس میوزیم میں داخل ہونے کی بہت کوشش کی مگر مسلمان اور پاکستانی شناخت ہونے کے سبب مجھے داخلے کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ میری درخواست پر غور جاری ہے، انتظامیہ کا کہنا ہے کہ آپ کو ای میل کے ذریعے مطلع کر دیا جائے گا، صاف انکار انہوں نے ابھی نہیں کیا ہے۔

بیونس آئرس کے مرکز میں تمام عمارتیں کثیر المنزلہ ہیں۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے تو یہ یورپ کا کوئی شہر معلوم ہوتا ہے، ہسپانوی اور اطالوی طرز تعمیر نمایاں ہے۔ ہسپانوی طرز تعمیر کی وجہ بھی قابل فہم ہے کہ یہ ملک صدیوں تک سپین کی نو آبادی رہا ہے اور 1810 میں اس نے آزادی حاصل کی ہے۔ لاطینی امریکہ میں ارجنٹائن ہسپانوی نو آبادیاتی سلطنت کی اسی طرح وارث ریاست ہے جس طرح سوویت یونین کی وارث روس کی ریاست ہے۔ چونکہ لاطینی امریکہ میں ہسپانوی سلطنت کا صدر مقام یہیں تھا۔ گنجان آباد اور جدید شہر ہونے کے باوجود بیونس آئرس میں ٹوکیو، نیویارک یا لندن جیسی بے چینی اور دوڑ دھوپ نظر نہیں آتی بلکہ ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور موسیقیت یہاں کا خاصہ ہے۔ جگہ جگہ رقص وموسیقی کا دور دورہ ہے۔ لوگوں کا عمومی معیارِ زندگی کافی بہتر ہے۔ ساحل سمندر کے ساتھ بنی سڑک پر وقفے وقفے سے ملک کے اہم کھلاڑیوں کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں۔ فٹ بال ٹینس، ہاکی، باکسنگ سے لے کر جمناسٹک اور دیگر کھیلوں میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے موجودہ اور سابق کھلاڑیوں کے مجسمے عوامی مقامات پر نصب کرنا ان کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک قابل تقلید طریقہ ہے۔ ساحل کے ساتھ اسی سڑک پر خواتین کے لئے مخصوص ایک ٹینس کلب کا نام پڑھ کر میں دیر تک اکیلا ہی ہنستا چلا گیا۔

آپ بھی سنیے کیا تخلیقی نام ہے "ڈارلنگ ٹینس کلب" یقیناً آپ کو بھی زنانہ ٹینس کلب کی تانیث بیان کرنے کے لیے یہ طریقہ پسند آئے گا۔ آپ کسی بھی وقت گھر سے نکلیں، ہر وقت تازہ دم ہواؤں کے جھونکے آپ سے ٹکرانے لگتے ہیں، مگر یہ ہوائیں "صرصر" نہیں بلکہ "صبا" کی سی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان ہواؤں سے متاثر ہو کر ہی اس شہر کا نام بیونس آئرس رکھا گیا یعنی "خوش کن ہوائیں" یا پھر ہسپانوی زبان سے اس کا ترجمہ "بادِ خوش گوار" بھی کیا جا سکتا ہے۔ سپین سے آنے والا وہ مہم جو یقیناً بہت باذوق ہو گا جس نے نیا شہر بسا کر پانچ صدیاں پہلے اس کو مدھر ہواؤں سے منسوب کر دیا۔ ان "اچھی ہواؤں" کا ہی

فیض ہے کہ گنجان آباد اور کثیر المنزلہ ہونے کے باوجود دنیا کے دیگر میٹروپولیٹین شہروں کی طرح یہ کنکریٹ اور اسفالٹ کا جنگل نہیں لگتا بلکہ زندہ دلوں کا شہر معلوم پڑتا ہے۔

ارجنٹائن میں سڑکوں اور چوراہوں کے نام عموماً دوست ممالک اور ان کے شہروں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ ملک کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ایام سے بھی شاہراہوں کو منسوب کیا گیا ہے، جیسے 9 جولائی نام کی سڑک تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ ویسے یہ چلن ارجنٹائن تک ہی محدود نہیں بلکہ لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ گلی، کوچے، سڑکیں اہم شخصیات کے علاوہ اہم دنول، دوست ممالک اور ان کے شہروں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ آپ کو شاید حیرت ہو کہ یہاں ''پاکستان چوک'' بھی ہے۔ سڑکوں کے کناروں پر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اور گلیوں، بازاروں میں گھومتے پھرتے خواتین کی اتنی بڑی تعداد سگریٹ نوشی کرتے میں نے اسی عالم رنگ و بو میں اور کہیں نہیں دیکھی، جتنی کثیر تعداد اس دیس میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میرا مطلب ہے عوامی مقامات پر اور وہ بھی آزادانہ چلتے چلتے مرد و زن کی کثیر تعداد تمباکو نوشی میں محو نظر آتی ہے۔ اٹھائیس لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل یہ جنت نظیر ملک فقط رقبے کے اعتبار سے دنیا کا آٹھواں بڑا ملک نہیں ہے بلکہ اپنے حسن اور ثقافت کی بنیاد پر دنیا کا آٹھواں بڑا عجوبہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں کا معیاری وقت پاکستان سے آٹھ گھنٹے پیچھے ہے مگر جب یہاں پہنچیں تو لگتا ہے یہ دنیا ہی کوئی مختلف ہے۔ صرف یہاں کا موسم ہی ہم سے متضاد نہیں، یعنی دسمبر میں گرمی اور جون سخت سردی کا مہینہ ہے، بلکہ ہمارے انداز زیست اور ان کے زندگی گزارنے کے ڈھنگ میں بھی کھلا تضاد ہے۔

خالد مسعود/ لاہور

ہونٹ اُن کے سربسر شانِ غزل
ہر اشارہ آنکھ کا جانِ غزل
اُن کی انگڑائی ہے اک عہدِ وفا
اور اُن کی چال پیمانِ غزل
یاد اُن کی سُرخیِ مضمونِ دل
ذکر اُن کے غم کا عنوانِ غزل
ہو سکی ہم سے کہاں تعریفِ دوست
کب ہوا پورا یہ ارمانِ غزل
ہم نے اِس میں ڈال دیں کلیاں نئی
تنگ ہی تھا گرچہ دامانِ غزل
اِس کا اک اک شعر تیرے نام ہے
میں نے بھی لکھا ہے دیوانِ غزل
دل سے یادِ اُن کی نہ ہو جائے الگ
ہے یہی مسعودؔ فرمانِ غزل

....

تماشا شوق سے یہ بار بار کرتے ہیں
مرے کرم پہ ستم اختیار کرتے ہیں
ترنم اُن کی صدا میں ادا میں شوخی ہے
مرے الم کو شگفتہ بہار کرتے ہیں
سبب جو ترکِ تعلق کا پوچھتا ہوں میں
ادا خموشی کی وہ اختیار کرتے ہیں
کہ اُن کی شوخی ستم گر ہے اس طرح ہم پر
کہ وقتِ وصل بھی دل بے قرار کرتے ہیں
ترے لباس میں گل ہائے رنگ رنگ کے ساز
صبا کے دوش پہ لطفِ ہزار کرتے ہیں
پھرے ہیں چاک گریبان کر کے فرقت میں
نگاہ و قلب و جگر پر ہی وار کرتے ہیں
جو دن گزرتا ہے مسعودؔ یاد سے غافل
ہم اُس کو رات میں اپنی شمار کرتے ہیں

محمد اقبال پیام شجاع آبادی/ لاہور

یہ جو اپنے زوال کا دکھ ہے
دکھ تو یہ بھی کمال کا دکھ ہے
پوچھتے ہو جواب کا مجھ سے
یارو مجھ کو سوال کا دکھ ہے
چاند سے بڑھ کے ہے حسیں وہ تو
چاند جیسی مثال کا دکھ ہے
مچھلیاں پھینک دی ہیں دریا میں
اب مجھے خالی جال کا دکھ ہے
ساتھ میرا دیا نہیں اُس نے
مجھ کو اپنی دھمال کا دکھ ہے
ہجر کا دکھ پیامؔ ہے سب کو
اور مجھ کو وصال کا دکھ ہے

طاہر عدیل/ ڈنمارک

اُس نے اک روز چھوڑ جانا تھا
اس طرف میں اُدھر زمانہ تھا
آ گرا خود ہی جھولی میں سورج
میرا تو چاند تک نشانہ تھا
کیسے بستا ہے میرے اندر وہ
اُس کو اُس سے کبھی ملانا تھا
کھل اُٹھا پھول کی طرح اک دن
زخم شاید کوئی پرانا تھا
کاٹ ڈالا ہے پیڑ جو تو نے
کچھ پرندوں کا وہ ٹھکانہ تھا
ویسے سب کچھ ہی بھول بیٹھا ہوں
وہ نہیں بھولا جو بھلانا تھا
میں ہرا دیتا گر اُسے طاہرؔ
اُس نے تو مجھ سے جیت جانا تھا

انٹرویو: امجد اقبال امجد

پاکستان سے باہر تارکین وطن پاکستانیوں کی سب سے بڑی آبادی متحدہ عرب امارات میں مقیم ہے۔ یو اے ای میں مقیم پاکستانیوں کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق پندرہ لاکھ کے قریب ہے جو مقامی آبادی سے دوگنا سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اسی تناسب کے سبب یہ دیس منی پاکستان محسوس ہوتا ہے۔ اس احساس کا سبب فقط ہماری وہاں مقیم آبادی نہیں بلکہ پاکستان اور اردو زبان کے روابط ہیں۔ پاکستانی ثقافت اور اردو زبان و ادب کے متحدہ عرب امارات کے ساتھ یہ ثقافتی رشتے مضبوط بنانے کے لیے کوشاں نامور شخصیات میں سے ایک امجد اقبال امجد ہیں۔ وہ صاحب دیوان شاعر ہیں اور پاکستانی ایسوسی ایشن دوبئی لٹریری سوسائٹی کے صدر بھی ہیں۔ گزشتہ دنوں دوبئی جانے کا موقع ملا تو ان کی دعوت پر پاکستان سنٹر، اور لائبریری کا بھی دورہ کیا۔ گرینڈ حیات ہوٹل میں انہوں نے ایک شاندار شعری نشست کا میرے اعزاز میں اہتمام کیا۔ کچھ فراغت محسوس ہوئی تو میں نے ارژنگ کے قارئین کے لیے ان سے انٹرویو کی فرمائش کر دی۔ یہ رسمی گفتگو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

ارژنگ: ابتدائی زندگی سے بات کی ابتدا کرتے ہیں۔ پیدائش کہاں ہوئی؟ ابتدائی زندگی کیسے گزری؟

امجد اقبال امجد: میری پیدائش کھاریاں کے نواح میں واقع ایک گاؤں سدھ میں ہوئی اور وہاں ہی میری ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہ گاؤں میجر عزیز بھٹی شہید نشان حیدر کے گاؤں کے بالکل پاس ہی ہے۔ میرے والد صاحب نے گاؤں میں ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ وہ ذہنی طور پر جماعت اسلامی سے نظریاتی وابستگی رکھتے تھے۔ میری عمر ابھی بہت چھوٹی تھی جب انہوں نے مجھے اس لائبریری کا انچارج بنا دیا۔ جو بھی آدمی لائبریری سے کتاب لے کر جاتا اس کے نام کا اندراج، جو کتاب واپس کرتا اس کا اندراج میں کرتا، اگر کوئی پندرہ دن سے زیادہ کتاب واپس نہ کرتا تو پھر اس سے میں دو روپیہ جرمانہ وصول کرتا تھا۔ میرے خیال میں یہیں سے میری کتابوں اور حرفوں سے دوستی شروع ہوئی تھی۔

ارژنگ: لکھنے کی ابتدا کیسے ہوئی؟

امجد اقبال امجد: جیسا کہ میں نے عرض کیا طبیعت میں موزونیت تو شروع سے ہی تھی اور پڑھنے لکھنے کا ماحول بھی میسر تھا، تین دہائیاں قبل جب میں دوبئی آیا تو یہاں پر سلیم جعفری کی قائم کردہ ایک ادبی تنظیم سے منسلک ہو گیا۔ انہوں نے یہاں جشن فروغ اردو ادب کے نام سے سالانہ مشاعرے کی خوبصورت روایت قائم کی۔ پاکستان سے بڑے بڑے نامور شعراء کو مدعو کیا جاتا اور ہندوستان سے بھی اردو زبان کے سرکردہ شعراء کرام ان کی دعوت پر دوبئی آنے لگے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیگم صاحبہ سے ملکر میں نے یہ شمع جلائے رکھی اور ابھی تک کسی نہ کسی رنگ میں ادبی و علمی سلسلہ جاری ہے۔

ارژنگ: آپ صاحب دیوان شاعر ہیں، اپنی تخلیقات کے بارے میں قارئین کو کچھ بتائیں؟

امجد اقبال امجد: میرا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے دل'' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس کی تقریب رونمائی مگر ہم نے یہاں دوبئی میں ہی رکھی تھی۔ دوستوں نے بھرپور پذیرائی بخشی اور قارئین نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اس کتاب کی رونمائی اور پذیرائی کی آدھ درجن تقریبات منعقد ہوئیں۔ دوسری کتاب لاہور سے نستعلیق پبلشرز نے شائع کی ہے۔ اعلیٰ طباعت کے ساتھ ساتھ اس میں میرا شعری سفر بھی ارتقائی اعتبار سے اگلی منزلوں کی طرف رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بھی پاکستان اور دوبئی میں کئی تقریبات منعقد ہوئیں۔ شعر و سخن سے وابستہ احباب نے بڑی پذیرائی بخشی۔

ارژنگ: آپ کی دوسری کتاب کی تقریب رونمائی جو لاہور میں ہوئی اس میں حاضری کا موقع تو ملا تھا مگر نام ذہن سے اتر گیا۔ بھلا کیا نام تھا؟

امجد اقبال امجد: دوسرے شعری مجموعے کا نام ''بارش والی شام'' تھا۔ کتاب کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لوگوں نے بہت پسند کیا۔

ارژنگ: آپ نثر بھی لکھتے ہیں.؟

امجد اقبال امجد: میں نے چند افسانے بھی تحریر کیے ہیں اور مضامین بھی نثر لکھنا بھی مجھے پسند ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرا حقیقی تخلیقی جوہر شاعری میں ہی اظہار پاتا ہے۔

ارژنگ: آپ کے علاوہ بھی متحدہ عرب امارات میں اردو شاعر موجود ہیں۔؟

امجد اقبال امجدؔ: مقامی شعراء میں ڈاکٹر زبیر فاروق اچھے شاعر ہیں۔ حالانکہ وہ عرب ہیں مگر اردو میں شعر کہتے ہیں، شفیق سلیمی اور سلیمان جاذب بھی اچھا شعر کہتے ہیں۔

ارژنگ: آپ نے پاکستان کی ثقافت اور اردو زبان کی متحدہ عرب امارات میں ترویج کے لیے بہت فعال کردار ادا کیا ہے، اس وقت ہماری ثقافت اور اردو زبان یو اے ای میں کہاں کھڑی ہے؟

امجد اقبال امجدؔ: جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں نے اپنے ادبی اور سماجی خدمت کا آغاز ''شامِ سخن'' تنظیم سے کیا۔ اس کا سربراہ اور مدار المہام بھی رہا، آج کل پاکستان ایسوسی ایشن دوبئی کے ادبی فورم کا میں صدر ہوں اس سفر میں ہم نے پاکستان اور اردو زبان کے لیے بڑی دل جمی سے کام کیا۔ آج جب اردو زبان اور پاکستانی ثقافت کا دوبئی میں چرچا دیکھتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ ہر دوسرا شخص یہاں اردو جانتا ہے۔ اردو بالخصوص دوبئی کی تو قومی زبان کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ وطن سے دور وطن کی خوشبو کی مثال دیکھنی ہو تو وہ متحدہ عرب امارات ہے، یعنی پاکستانی ثقافت اس قدر یہاں رچ بس گئی ہے۔

ارژنگ: آپ نے مجھے پاکستان سنٹر کا دورہ کروایا اور اس میں قائم اردو لائبریری بھی ملاحظہ کی، اتنا بڑا پراجیکٹ آپ لوگوں نے حکومتی مدد کے بغیر اپنی مدد آپ کے تحت کیسے مکمل کیا؟

امجد اقبال امجدؔ: ہماری خوش قسمتی کہ دوبئی حکومت نے ہمیں چند دیگر دوست ممالک کے ساتھ ایک وسیع قطعہ اراضی تحفے میں دیا۔ پاکستانی کمیونٹی میں ہم نے Fund Raising کر کے ایک عظیم الشان آڈیٹوریم بنایا جس میں آپ نے دیکھا ایک ہزار لوگ با آسانی بیٹھ سکتے ہیں، کھیلوں کے مقابلے ہو سکتے ہیں۔، پاکستانیوں کے مفت علاج کے لیے اسی میں اسپتال بن رہا ہے جو کہ اپنی تعمیر کے آخری مراحل میں ہے۔ باسکٹ بال، بیڈمنٹن اور ٹینس کے میدان بنائے گئے ہیں۔ ایک پاکستانی اہل دل کی فیملی نے اردو لائبریری عطیہ کی ہے۔ جو انہی کے نام سے نیاز علی لائبریری مشرق وسطیٰ میں اردو کتابوں کا انشاء اللہ سب سے بڑا ذخیرہ ہوگی۔

ارژنگ: پاکستان سنٹر میں کوئی سکول بھی کھول رہے ہیں؟

امجد اقبال امجدؔ: یہاں پر پہلے ہی بفضل خدا گیارہ پاکستانی سکول قائم ہیں اور بڑے بھرپور انداز میں طالب علموں کو پاکستان اور اردو زبان سے مکمل تعارف فراہم کر رہے ہیں۔ آبادی کی غالب اکثریت تو ویسے ہی مسلمان ہے اور ریاست کا بنیادی ڈھانچہ بھی اسلامی ہے۔ اس لیے وہ تو ہم تارکین وطن کے لیے پہلے ہی ایک نعمت میسر ہے۔

ارژنگ: آپ کا ادبی سفر کیسا چل رہا ہے؟ آج کل کسی موضوع پر زیادہ کام کر رہے ہیں؟

امجد اقبال امجدؔ: میں شعر و سخن سے اپنی وابستگی باعث عزت سمجھتا ہوں۔ شعری سفر رواں دواں ہے البتہ نثر ذرا کم کم لکھتا ہوں۔ شعر و سخن تو سانس کے ساتھ منسلک لگتے ہیں۔ سانس لیتے ہیں، شعر کہتے ہیں۔

عامر بن علی / جاپان

کوئی خواہش دبی ہے سینے میں
ورنہ اب کیا مزا ہے جینے میں
اب کے اپریل زخم چھوڑ گیا
پھول کھلتے تھے اس مہینے میں
چند گھڑیاں نشاطِ وصل کی تھیں
زیست کی زہرِ ہجر پینے میں
اک محبت ہی جرم تھا اپنا
عمر گزری ہے زخم سینے میں
عاشقی میں جو مِٹ گئے تو کھلا
نشہ ہے خاص اس قرینے میں

....

دشمن نہ سہی دوست مگر اچھے نہیں تھے
وہ لوگ جو مدّت سے مرے دل کے مکیں تھے
موسم کے بدلنے سے جو بدلے ہیں وہ ساتھی
کیا جانے کہاں کھو گئے کل تک تو یہیں تھے
شاہی سے نہ تکریم ملے خلقِ خدا کی
کم ظرف تھے اکثر جو یہاں تخت نشیں تھے
کب ہاتھ ملا لینے سے دل ملتے ہیں صاحب
ان سے بھی ملے زخم جو ایمان و یقیں تھے
کس دل سے چلیں آج اسی بزم میں عامرؔ
دیکھا ہی نہیں یار نے ہم کل بھی وہیں تھے

انٹرویو: تبسم انوار

ارژنگ: اپنے بارے میں مختصر بتائیے

ج: اسلام علیکم ۔لبنیٰ صفدر سب سے پہلے تو میں آپ کا اور ماہنامہ ارژنگ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ نے آج کے انٹرویو کے لیے میرا انتخاب کیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے از حد مسرت ہو رہی ہے کہ ماہنامہ ارژنگ ادبی حلقوں میں اپنی ایک منفرد پہچان بنا چکا ہے اور میری دعا ہے کہ اسے آنے والے دنوں میں مزید کامیابیاں عطا ہوں۔

میرا پورا نام تبسم انوار ہے۔ میں ادبی نام کے طور پر بھی یہی نام استعمال کرتی ہوں۔ تخلص ''تبسم'' ہے۔

پیدائش کراچی میں ہوئی اور وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ شادی کے چند سال بعد ہماری فیملی کینیڈا سیٹل ہوگئی۔ تقریباً بائیس سال سے کینیڈا کے شہر مانٹریال میں مقیم ہوں۔

ارژنگ: آپ کی ادبی اور غیر ادبی کیا مصروفیات ہیں؟

ج: جب بچے ذرا سمجھدار ہو گئے تو میں نے اپنے شوق یعنی شاعری کی آبیاری شروع کی اور 2006 سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ میں مقامی اخبار میں ایک کالم ''آگہی کے دریچے'' کے نام سے لکھتی رہی ہوں اور مقامی ٹی وی چینل میں ''ہیلو کینیڈا'' کے نام سے ایک ٹاک شو بھی کرتی رہی۔ علاوہ ازیں کئی اسٹیج پروگرامز کی میزبانی کی۔ مقامی ادبی تنظیموں کا حصہ رہی اور بالآخر 2013ء میں کاروانِ ادب مانٹریال کی بنیاد رکھی جو کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے معیاری ادبی پروگرامز اور کامیاب مشاعروں کے انعقاد کے حوالے سے اپنی ایک پہچان بنا چکا ہے۔

ارژنگ: پاکستان اور غیر ملک میں رہنے میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

ج: پاکستان اور بیرونِ ملک رہنے میں جس فرق کے بارے میں آپ نے سوال پوچھا ہے تو اس کے بارے میں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ آپ چاہے ساری زندگی بیرونِ ملک گزار لیں لیکن آپ کے دل سے پاکستان کی محبت کبھی کم نہیں ہوتی۔ شہریت چاہے کسی بھی ملک کی اپنا لیں لیکن دل پاکستانی ہی رہتا ہے۔ آج بھی میں خود کو کراچی کے ہی گلی کوچوں میں محسوس کرتی ہوں۔ اس مٹی کی مہک آج بھی میرے احساسات کو معطر رکھتی ہے۔ ایک بنیادی فرق جو میں محسوس کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ یہاں اظہارِ رائے کی آزادی ہے۔ قانون کی بالادستی ہے، تعلیم اور روزگار کے مواقع سب کو یکساں میسر ہیں۔ میری دعا ہے کہ کاش یہ ساری سہولیات میرے وطن کے غریب عوام کو بھی میسر ہوں۔

ارژنگ: باہر کے ملک میں رہنے کے فائدے اور نقصانات کیا کیا ہیں؟

ج: بیرونِ ملک میں رہائش کے فوائد میں سرِ فہرست یہاں کی معاشی خوشحالی ہے۔ پاکستانی دنیا میں جہاں جہاں گئے ہیں وہاں اپنی محنت، لیاقت اور لگن کی بدولت اس خوشحال معاشرے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تمام قومی اور مذہبی تہواروں کو سب ایک ساتھ مل کے ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کے نہایت جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ تب دل میں ایک سرشاری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ہم پاکستان میں بھی اسی اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ ان سب اچھائیوں کے باوجود جس چیز کا دل کو قلق رہتا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل اپنی جڑوں سے دور ہے اور اپنی قومی ثقافت سے اس طرح فیض یاب نہیں ہو رہی جیسے پاکستان میں رہتے ہوئے ہو سکتی تھی۔

ارژنگ: باہر رہ کر آپ کو کیا لگتا ہے کہ پاکستان یا پاکستانیوں میں کس چیز کی کمی ہے؟

ج: ملک سے باہر رہ کر پاکستان میں جس کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس مملکت خداداد کو ایک مخلص اور مدبر رہنما کی ضرورت ہے جو یہاں کے بے پناہ قدرتی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک کو ترقی کی شاہراہوں پر گامزن کر سکے۔ ویسے اس ملک اور اس میں بسنے والوں میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ محبت، اخوت، نوجوان طبقے میں ترقی کی لگن، قدرتی وسائل سب ہی تو یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ارژنگ: کوئی ایسی خوبی جو پاکستان میں ہے لیکن باہر کے ممالک میں نہیں ہے؟

ج: پاکستان میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن کا نعم البدل باہر کے ممالک میں نہیں ملتا جیسے کہ پاکستانی پھلوں جیسی مٹھاس اور مہک یہاں کے پھلوں میں نہیں ملتی۔ نہ ہی پاکستان کے پھولوں جیسی خوشبو بیرونِ ملک کے پھولوں میں ہے۔ اس طرح سے رشتوں میں جو خلوص اور اپنائیت کی مہک پاکستان میں پائی جاتی ہے وہ بھی یہاں ناپید ہے۔ ادبی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو بھلے ہی ہم اپنے اشعار پر یہاں ڈھیروں داد سمیٹیں لیکن جو لطف لاہور اور کراچی سے ملنے والی داد کا ہوتا ہے اس کی بات ہی الگ ہے۔ یاں ہم ان نشستوں کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں جو پاکستان کے بڑے ادبی مراکز کا خاصہ ہیں۔

ارژنگ: اپنے ادبی سفر کی روداد بتائیے۔

ج: میرے ادبی سفر کی روداد یہ ہے کہ لکھنے کا عمل تو کافی پہلے شروع ہو چکا تھا مگر باقاعدہ آغاز 2006 سے ہوا۔ غزل، نظم، ہائیکو اور افسانے میں طبع آزمائی کرتی ہوں لیکن غزل کا طلسم سب سے فزوں تر رہا۔ اب تک دو شعری مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''اک تبسم زیرِ لب'' 2012 میں کینیڈا سے اشاعت پذیر ہوا جبکہ دوسرا مجموعہ 2015 میں ماورا پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ تیسرا شعری مجموعہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔ جبکہ افسانوں کا مجموعہ مکمل ہو چکا ہے جس کی اشاعت مستقبل قریب میں متوقع ہے۔

ارژنگ: دورِ جدید اور قدیم کا اہم شاعر کسے سمجھتی ہیں

اور کیوں؟
ج: دورِ جدید کے اہم شعرا میں اقبال، فیض، فراز اور افتخار عارف کو سمجھتی ہوں اور اس کی بنیادی وجہ ان کے کلام کے پیچھے ان کا منفرد اسلوب اور افکار کی گہرائی ہے۔ خواتین میں پروین شاکر اور ادا جعفری کو میں پسند کرتی ہوں۔ جو نسائی رنگ ان دونوں خواتین نے اُردو شاعری کو عطا کیا وہ انھی کا حصہ ہے۔

عہدِ قدیم کے شعرا میں غالب، میر، مومن اور ذوق میرے پسندیدہ ہیں۔ غالب اور میر کے کلام کی تعریف تو خیر کیا ہو، ایک جہان ان کا گرویدہ ہے۔ مومن کے کلام کی سلاست اور ذوق کا استادانہ رنگ دل کو اپنے طلسم کا اسیر کر لیتا ہے۔

ارژنگ: آپ کے خیال میں اعلیٰ شاعری کی پہچان کیا ہے؟

ج: میرے نزدیک اعلیٰ شاعری کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے اندر آفاقیت سموئے ہوئے ہو۔ کسی بھی زمانے کا قاری اس کا مطالعہ کرے تو وہ اسے اپنے ہی قلبی واردات سمجھے۔ میر و غالب کی شاعری اسی خصوصیت کی بنا پر لازوال ہو گئی ہے۔ اعلیٰ شاعری اپنے عہد کا فسانہ رقم کر رہی ہوتی ہے اور اپنے دور کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ایک اچھے شعر کی پہچان کا تعین اس کے خیال کی گہرائی اور کرافٹ پر شاعر یا شاعرہ کی گرفت سے ہوتا ہے۔

ارژنگ: کیا آپ کو لگتا ہے کہ آج کا ادیب/ شاعر بہترین ادب تخلیق کر رہے ہیں؟

ج: آج کے ادیب اور شاعر کی تخلیقات کے بارے میں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ پاکستان میں اس وقت عمدہ اور معیاری کلام تخلیق کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح بیرونِ ملک میں شعر و سخن کے سودائی بھی پوری لگن کے ساتھ اردو ادب کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان سے بہت دور شمالی امریکہ میں اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ پاکستان کے ادبی منظر نامے پر نوجوان شعرا جدت لیے ہوئے چونکا دینے والا شعر کہہ رہے ہیں جو آج کے عہد کی عکاسی کر رہا ہے۔

ارژنگ: آپ ادب برائے ادب کی قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کی؟

ج: میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔ کیونکہ ادب برائے ادب سے آپ کو وقتی شہرت داد و تحسین تو مل سکتی ہے مگر وہ شاعری اگلے زمانوں میں سفر کرنے والی نہیں ہوتی اور شاعر کے ساتھ ہی دم توڑ دیتی ہے۔ جب کہ ادب برائے زندگی بنیادی انسانی رویوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر دور میں سراہا جاتا ہے۔

ارژنگ: کیا آج کا شاعر اور ادیب معاشرے میں پیدا شدہ خرابیوں اور مسائل کا اصلی چہرہ بھی پیش کر رہے ہیں؟

ج: میرے خیال میں آج کا شاعر اور ادیب اپنے کلام اور اپنی نگارشات کے ذریعے معاشرتی ناانصافیوں اور سماج کے مسائل کا اصلی چہرہ پیش کر رہا ہے۔ یہ ذمے داری ہر دور کے اربابِ سخن پر عائد ہوتی ہے اور آج کے لکھنے والے بھی اس ذمے داری کو احسن طریقے سے نبھا رہے ہیں۔

ارژنگ: آپ ایک ادبی تنظیم کاروانِ ادب مونٹریال کی صدر بھی ہیں۔ اس حوالے سے اپنی خدمات کے بارے میں تفصیل سے بتائیے۔

ج: اپنی ادبی تنظیم کاروانِ ادب مانٹریال کی صدر کی حیثیت سے شمالی امریکہ میں اردو ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے جو کچھ بھی میرے بس میں ہے وہ میں کرنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ ہم اپنی زبان اور ثقافت کو اپنی اگلی نسلوں تک منتقل کر سکیں۔ ہمارے ادبی پروگرامز اور سالانہ مشاعرے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں جس میں ہم عہدِ حاضر کے نامور شعرا کو مدعو کرتے ہیں اس کے علاوہ کینیڈا کے مختلف شہروں کی ادبی تنظیموں کے ساتھ ہمارے دوستانہ روابط ہیں جس سے اردو شاعری اور مشاعروں کے انعقاد کو تقویت ملتی ہے۔ ان ادبی محاصل کی روداد آپ کاروانِ ادب کے فیس بک اکاؤنٹ پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ (Caravan e Adab Montreai) جلد ہی ان ویڈیوز کو اپنے یوٹیوب چینل پر بھی منتقل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ دیارِ غیر میں اُردو ادب کی ترویج کے لیے تسلی بخش کام ہو رہا ہے؟

ج: جہاں تک دیارِ غیر میں اردو ادب کی ترویج کے لیے کام کا تعلق ہے اس ضمن میں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ کسی بھی معاشی فائدے کو فراموش کر کے تمام تنظیمیں اپنے اپنے محدود وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو زبان کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ میں گزشتہ سالوں میں دو میگزین نکالتی رہی ہوں جس میں ایک صفحہ اردو شاعری کے لیے مختص تھا جس میں پوری دنیا سے اردو شعرائے کرام کا تعارف اور ان کے کلام سے قارئین کو روشناس کرایا جاتا تھا۔ اسی طرح سے نامور نثر نگاروں کی تخلیقات اس کی زینت بنتی تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ پاکستان سے باہر دنیا بھر میں ایسی لاتعداد تنظیمیں ہیں جو اردو شعر و سخن کی ترقی کا علم اُٹھائے ہوئے ہیں۔

ارژنگ: اپنا کوئی شعر؟

ج: ہجرت اور دیارِ غیر کی کٹھنائی اور وطن کی محبت میں ڈوبے میرے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

گزر بسر تھی اس میں تو عزیز ہم کو تب بھی تھا
جو دربدر ہوئے ہیں تو وطن سے عشق ہو گیا
رہنے نہیں دیا مجھے اس غم نے چین سے
مٹی مری کہاں کی تھی اور میں کہاں رہی

ارژنگ: نئے لکھاریوں اور ادب کی خدمت کرنے والوں کے لیے پیغام۔

ج: نئے لکھنے والوں کو میں یہ پیغام دینا چاہتی ہوں کہ جو کچھ بھی لکھیں، اپنے اردگرد کے حالات، مختلف انسانی رویوں اور معاشرتی ناہمواریوں پر قلم اُٹھائیے۔ شعر کے مضمون کے ساتھ الفاظ کی بنت پر بھی توجہ دیں۔ جدید شعرا کے ساتھ کلاسک شعرا کا مطالعہ ضرور کریں۔

میں ایک بار پھر ماہنامہ ارژنگ کی ممنون ہوں جس کے توسط سے مجھے تمام قارئین تک اپنے خیالات پہنچانے کا موقع ملا۔

شاعری

کس درجہ بدگمانیوں کا دل شکار ہے
تو روبرو ہے اور ترا انتظار ہے
جو سن رہا ہوں کتنے لبوں کی ہیں سسکیاں
جو کہہ رہا ہوں کتنے دلوں کی پکار ہے
وہ انقلاب آیا کہ قدریں بدل گئیں
جو پہلے بے وقار تھا اب باوقار ہے
اس عہد کم نگاہ کا برتاؤ دیکھئے
انسان سے نہیں ہے رویوں سے پیار ہے
پژمردہ پھول پھول ہے بے کل کلی کلی
میں کیسے مان لوں کہ یہ فصلِ بہار ہے
کس دکھ میں مبتلا ہے جو روتا ہے رات دن
یہ کس کی چشمِ گریہ پسِ آبشار ہے
گل چیں ہے کوئی اور کوئی گل فروش ہے
اس شہر میں یہ خاصا بڑا کاروبار ہے
میں نے ہر ایک دل میں بنالی ہے اک جگہ
چہرہ کسی کا ہو مرا آئینہ دار ہے
نصرتؔ میں کیا بتاؤں شب و روز کے ستم
اس زندگی میں قبر سے بڑھ کر فشار ہے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

میں اپنی آنکھ کو دریا نہیں بناؤں گا
نہیں! میں خود کو تماشا نہیں بناؤں گا
مجھے یہ درد مرے چارہ گر نے بخشا ہے
کسی کو اپنا مسیحا نہیں بناؤں گا
وہ جس کے پاؤں سے لپٹی ہوئی غلامی ہو
میں ایسا کوئی پرندہ نہیں بناؤں گا
میں تیرے ساتھ چلوں گا، پر اپنے قدموں پر
سفر میں دوسرا رستہ نہیں بناؤں گا
تری شبیہ بناتا رہوں گا کاغذ پر
مگر میں چاک پہ تجھ سا نہیں بناؤں گا
فلک نشین ہے تو اور میں ہوں خاک نشیں
زمیں پہ تیرا سراپا نہیں بناؤں گا
وہ جس کی چھاؤں پہ ہو دھوپ کا گماں خورشیدؔ
میں ایسے پیڑ کا سایہ نہیں بناؤں گا

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

وہ تپش تھی مرے فسانے میں
لگ گئی آگ آشیانے میں
ایک تو مختصر تھی عمر مری
اس نے بھی دیر کی تھی آنے میں
وہ جو پل تیرے التفات کا تھا
عمر گزری اُسے بھلانے میں
میں محبت کا نقش آخر ہوں
کیا ملے گا مجھے مٹانے میں
مقصدِ زیست ہو گیا پورا
مٹ گیا میں اُسے بچانے میں
جب دیا اُس نے میرے ہاتھ میں ہاتھ
ایک طوفاں اُٹھا زمانے میں
زندگی ساری لگ گئی جاویدؔ
سرد جذبات کو جگانے میں

جاوید صدیق بھٹی/لاہور

جب ترے بازوؤں کا ہالا تھا
میرے چاروں طرف اُجالا تھا
چاندنی بن کے چھا گیا دل پر
وہ ستارہ جو گرنے والا تھا
اُس کی آنکھوں میں تھی جفا کی کرن
میرے ہونٹوں پہ کوئی تالا تھا
روح کو اس نے کر دیا روشن
تیری آنکھوں میں جو اُجالا تھا
خوبصورت خطا ہوئی مجھ سے
میں نے دل دے کے درد پالا تھا

جاوید صدیق بھٹی/لاہور

تاروں کو اپنی سمت کو شب گیر کھینچتا
چشمِ انا میں خواب کی تعبیر کھینچتا
ایسا کوئی تو ہوتا مصور جو بھیڑ میں
شاعرِ فاقہ مست کی تصویر کھینچتا
سارے قلم فروش تھے سارے سخن فروش
ایسے میں کون عدل کی زنجیر کھینچتا
ترکش بدوش پھرتے ہیں صیاد ہر طرف
اندیشہ ہائے دیدۂ نخچیر کھینچتا
مقتل میں کتنے لوگ مرے آس پاس تھے
کوئی تو میرے سینے سے بھی تیر کھینچتا
میں تو جہاں میں شاعرِ خود دار ہوں اسدؔ
کیسے مجھے زمانہ بے پیر کھینچتا

اسد اعوان/سرگودھا

اقبال کے رنگ میں

جس جا بھی قدم رکھ دوں اُگیں لالہ و ریحاں
جو بات کہوں اس سے گلستاں ہو خوش آہنگ
وہ سوز ہو پوشیدہ مری طرزِ نوا میں
طائر ہوں سبھی مائل پرواز مرے سنگ
اُڑتی ہوئی تتلی کو کتابوں میں نہ رکھو
دنیا یہ کشادہ ہے اگر ظرف نہ ہو تنگ
کردار کے جوہر ہوں کہ اخلاص کے موتی
آفاق حقیقت میں ہے مجموعہ اورنگ
ہم رنگِ زمیں بوریا ہو مسند شاہی
آنکھوں کو نہ بے نور کرے جلوۂ افرنگ
جو مردے کے حالات ہیں وہ مردہ ہی جانے
اک قبر پہ ہے پھول تو اک قبر پہ ہے سنگ

سعید پسروری/لاہور

ٹوٹتے جاتے ہیں پیمان تمہارے سارے
بجھتے جاتے ہیں اُمیدوں کے ستارے سارے
کوئی زحمت کسی دشمن کو اُٹھانی نہ پڑے
مہرباں ہم پہ رہے دوست ہمارے سارے
عصر موجود کی بے رحم ہوا کے جھونکے
لے گئے چھین کے بچوں کے غبارے سارے
وسعتِ فکر و تخیل کے سزاواروں نے
تنگ دستی میں شب و روز گزارے سارے
ایک اک کر کے جدا ہو گئے یارانِ حسیں
وقت نے چھین لیے دل کے سہارے سارے
راکھ ہی راکھ اُڑی پھرتی ہے دل میں ہر سُو
جل گئے آپ کی یادوں کے شمارے سارے
تیرے ہر ظلم کا سہنا پڑا طعنہ مجھ کو
قرض تجھ پر تھے مگر میں نے اُتارے سارے
سب ترے نام غزالی ہیں منافعے میرے
ڈال دے تو مرے کھاتے میں خسارے سارے

غزالی/گوجرہ

وہ سارے موسموں سے لڑ رہا ہے
شجر دیکھو اکیلا ہی کھڑا ہے
پسِ پردہ جو روتا ہے اکیلا
وہی خوشیاں جہاں کو بانٹتا ہے
ہم آثارِ قدیمہ کی طرح ہیں
زمانہ ہے کہ آگے جا چکا ہے
وہ جس لمحے محبت ہو گئی تھی
وہ لمحہ اب تلک ٹھہرا ہوا ہے
دُعائیں بے اثر ہونے لگی ہیں
ہر اک لہجہ یہاں بدلا ہوا ہے
وہ آوازیں کہاں گم ہو گئی ہیں؟
کہاں کوائل، کہاں اب فاختہ ہے؟

غزالی/گوجرہ

گھر میں اُٹھتی ہوئی دیوار گرا دیتا ہوں
اپنا سامان اُٹھاتا ہوں دعا دیتا ہوں
شکر کرتا ہوں اگر کچھ بھی نہ ہو پاس مرے
اور کبھی ہو بھی تو سائل کو تھما دیتا ہوں
تجھ کو واپس چلے جانے کی تمنا ہے اگر
میں، چلو، فیصلہ اپنا بھی سنا دیتا ہوں
جیت مقصود ہے پیارے مجھے اس بار تری
دیکھ کیسے میں نشانے کو ہلا دیتا ہوں
اگر آنا ہے مقابل تو چلو یوں ہی سہی
میں بھی اس بار کوئی حشر اُٹھا دیتا ہوں
اور اگر لوٹ کے آنا ہے تو سب چھوڑ کے آ
میں پھر اک بار زمانے کو بھلا دیتا ہوں
دیکھ نظروں کو چرا کر مری جانب تو بھی
میں بھی چہرے کو تری سمت گھما دیتا ہوں
دلِ برباد کی سنتا ہے بھلا کون یہاں
آئنہ جتنی سنے، اُتنی سنا دیتا ہوں
خود کو شانوں پہ اُٹھائے ہوئے پھرتا ہوں یہاں
گرنے لگتا ہوں تو پھر تجھ کو صدا دیتا ہوں
میرا کیا ہے کہ میں غم اپنا چھپانے کے لیے
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسا دیتا ہوں

زاہد محمود زاہد/ملتان

وہ جو خاموشیوں کے بانی ہیں
سر سے پاؤں تلک کہانی ہیں
اُس کی آنکھیں شعور والوں میں
روشنی کے نئے معانی ہیں
سائیاں! اک دعا کا طالب ہوں
چند یادیں ہیں جو بھلانی ہیں
میرے تو خواب بھی زمینی ہیں
اُس کی آنکھیں بھی آسمانی ہیں
کر کے یکجا اُداس لوگوں کو
کچھ نئی بستیاں بسانی ہیں
ساری خاموش لڑکیاں، شہبازؔ
وقت آنے پہ مسکرانی ہیں

شہباز نیرؔ/رحیم یار خاں

جو اپنا کام تھا وہ کر چلے ہیں
مسافر اپنے اپنے گھر چلے ہیں

سبھی احباب۔ تھے محفل میں لیکن
نہ جانے اب کہاں اُٹھ کر چلے ہیں
ہماری گردنوں پہ جانے کتنے
امیرِ شہر کے خنجر چلے ہیں
کئی لوگوں نے فن کو بیچ ڈالا
کئی لوگوں کے اس سے گھر چلے ہیں
مجھے احباب تنہا کر گئے ہیں
تری جانب کئی لشکر چلے ہیں
مسعود تنہا/ ساہی وال

بنے کہیں بھی جو مشکل دعا علیؑ سے کریں
کہ پیار دنیا میں مشکل کشا علیؑ سے کریں
کسی بھی در پہ ضرورت نہیں ہے جانے کی
چلو کہ مل کے چلیں التجا علیؑ سے کریں
مثالِ بو ذر و قنبر جئیں زمانے میں
یہ جان جائے تو جائے وفا علیؑ سے کریں
کسی کے سامنے جھکنا ہمیں نہیں آتا
نمک حلال ہیں ہم کیوں دغا علیؑ سے کریں
یہی تو حکمِ شہِ دو جہان ہے تنہا
ہم اپنے آپ کو کیسے جدا علیؑ سے کریں
مسعود تنہا/ ساہی وال

حشر کیسا پسِ دیوار اُٹھاتا ہے کوئی
میرے آنگن کی پلی دھوپ چراتا ہے کوئی
کیا خبر آپ کو جلتے ہوئے کاشانوں کی
آپ تو آگ لگاتے ہیں بجھاتا ہے کوئی

دل کو دھڑکا سا لگے جب بھی چلے سرد ہوا
آنکھ ہر بار یہی پوچھے کہ آتا ہے کوئی
مجھ میں آتا ہے کوئی راکھ اُڑانے کے لیے
مجھ میں ہر شام دیا آ کے جلاتا ہے کوئی
اب یہ دل چاہے اسی شہر کی گلیوں کا طواف
یعنی اب ہم کو سرِ دار بلاتا ہے کوئی
تم کو جینا ہے مری "زلف کے سر ہونے تک"
خواب میں آ کے مجھے یاد دلاتا ہے کوئی
اک ادھوری سی محبت کا معمہ ہے رضا
یاد کرتے ہیں کسی اور کو، آتا ہے کوئی
رضا جعفری/ ساہی وال

مار دیتے ہیں محبت میں ہمیں غم اکثر
اس لیے بھی میں پریشان ہوا کم اکثر
تیرے اصرار پہ یہ مان لیا ہے میں نے
حسن ہوتا ہے وفادار بہت کم اکثر
اس لیے چھوڑ دی ہے چارہ گری زخموں کی
درد کو اور بڑھا دیتا ہے مرہم اکثر
چاند جلتا ہے ترے حسن سے اکثر جاناں
ذکر کرتے ہیں ستاروں سے ترا ہم اکثر
کون یہ رات کو روتا ہے فلک پر فیصل
صبح ہوتی ہے تو ہوتی ہے زمیں نم اکثر
فیصل کاشمیری/

کبھی تنہا سفر ہوتا نہیں ہے
سفر ہوتا ہے پر ہوتا نہیں ہے

خدا نے خوبیاں رکھی ہیں سب میں
کوئی بھی بے ہنر ہوتا نہیں ہے
ہمیشہ خود غرض ہوتا ہے انساں
کبھی کوئی شجر ہوتا نہیں ہے
بناتا ہوں بہت منصوبے لیکن
کوئی بھی کارگر ہوتا نہیں ہے
یہی سچ ہے اگر سچا ہو کوئی
کسی کا اس کو ڈر ہوتا نہیں ہے
ظفر اک دل میں رہنے والا بندہ
کبھی بھی دربدر ہوتا نہیں ہے
ظفر اعوان/ ڈنمارک

تم سے کنارا کر بیٹھا ہوں
کتنا خسارا کر بیٹھا ہوں
پہلی بار کو بھول کے میں تو
پیار دوبارہ کر بیٹھا ہوں
موج ڈبونے آئی ہے جو
اس کو سہارا کر بیٹھا ہوں
شبنم کیسی؟ اشکوں سے اب
میں تو گزارا کر بیٹھا ہوں
دل دیوانہ بہلتا نہیں ہے
تیرا نظارہ کر بیٹھا ہوں
جانے اُجرت کب دے گا وہ
کام تو سارا کر بیٹھا ہوں
پیار سے تم نے روکا تھا ناں
میرے یارا کر بیٹھا ہوں
راتوں کو روتا ہوں آسی
ذرّہ تارا کر بیٹھا ہوں
عدیل احمد آسی/ ڈنمارک

مختصر ادبی خبریں

- معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی انتقال کر گئے۔ ادب کا درخشاں باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔
- نامور ادیبہ بشریٰ رحمٰن کے خاوند ۲۷ رمضان کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم گزشتہ کچھ عرصہ سے بستر علالت پر تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین
- ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر حسن عباسی کے بڑے بھائی گزشتہ دنوں بہاولپور میں انتقال کر گئے۔ ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم ان کی وفات پر سوگوار ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔
- معروف شاعرہ اور بہت سے شعری مجموعوں کی خالق باجی نسیم اختر امریکہ میں وفات پاگئیں۔
- بہزاد جاذب کے والد مختصر علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔
- خوبصورت نوجوان شاعر سیّد عون نقوی گزشتہ دنوں اچانک وفات پا گئے۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔
- پشتو کے ممتاز شاعر داد محمد دلسوز داغِ مفارقت دے گئے۔
- امریکہ میں مقیم ممتاز سکالر، مترجم اور افسانہ نگار محمد عمر میمن اب اس دنیا میں نہیں رہے۔
- نیویارک کے کالم نگار اور ٹی وی پروڈیوسر جاوید اختر جانثار انتقال فرما گئے۔
- ہزاروں کتابوں کے مصنف اور عمران سیریز کے سینکڑوں ناول لکھنے والے نامور ادیب مظہر کلیم ایم اے ملتان میں طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔
- ممتاز شاعر، دانشور اور نقاد محترم جلیل عالی صاحب کو اقبال اکیڈمی پاکستان کی گورننگ باڈی کا رکن ہونے پر دلی مبارک باد۔
- تحریک نفاذ اُردو و صوبائی زبان، انجمن ترقی پسند مصنفین اور دلی آرٹس فورم کے اشتراک سے معروف شاعر، صحافی اور براڈ کاسٹر اقبال سہوانی کے شعری مجموعے ''محبت رقص کرتی ہے'' کی تقریب پذیرائی کراچی جم خانہ میں منعقد ہوئی۔
- ساؤتھ انڈیا اور تامل زبان کے مشہور ناول نگار بالا کماران ۷۱ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔
- آرٹس کونسل کراچی میں امریکہ سے آئی ہوئی معروف شاعرہ عشرت آفرین کی کلیات ''زرد بن'' کی تقریب رونمائی ہوئی۔
- ہندکو کے معروف شاعر مرزا اطہر ضیا برین ٹیومر کے باعث انتقال فرما گئے۔
- محکمہ ثقافت سندھ اور آرٹس کونسل کے زیر اہتمام عالمی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت کشور ناہید نے کی۔ دنیا بھر سے شعرا نے شرکت کی اور یہ ایونٹ پانچ دن جاری رہا۔
- بزمِ اُردو ادب کی جانب سے ۱۳ مئی کی شام محمد ایوب صابر کی الوداعی تقریب کا اہتمام الاصاء کے ولیج ریسٹورنٹ میں کیا گیا۔ یاد رہے کہ محمد ایوب صابر دیارِ غیر سے مستقل وطن واپس آ چکے ہیں۔
- حلقہ اربابِ ذوق کے زیر اہتمام قائم نقوی کے ساتھ شام منائی گئی جس میں فرحت عباس شاہ، خالد شریف، توقیر احمد شریفی، تاثیر نقوی، حکیم سلیم اختر اور نیلم احمد بشیر نے شرکت کی۔
- معروف شاعرہ مینی مظفر حرکت قلب بند ہونے سے چل بسیں۔
- فاطمہ ادبی فورم کی ماہانہ نشست گلبرگ اکادمی ادبیات میں منعقد ہوئی جس کی صدارت نیلما ناہید درانی نے کی۔ جبکہ نیلم احمد بشیر مہمانِ خصوصی تھیں اور اختر ہاشمی نے بھی بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔
- خان پور کے معروف آرٹسٹ، پینٹر اور غزل گائیک سیّد زاہد نقوی انتقال فرما گئے۔
- معروف شاعر اور دانشور ڈاکٹر سرمد کامران وفات پا گئے۔
- حرف اکادمی کی جانب سے راولپنڈی آرٹس کونسل میں اعتبار ساجد کی ''جانم'' کی تقریب پذیرائی منعقد کی گئی۔
- افاج انٹرنیشنل ادبی فورم جہلم کے زیر اہتمام ''نئے عالمی سیاسی وسماجی منظر نامے میں ادب اور ادیب کا کردار'' کے موضوع پر سیمینار منعقد

کیا گیا جس کی صدارت اقبال حسین خان (سابق ڈپٹی کمشنر جہلم) نے کی۔

✦ ممتاز شاعر اختر عثمان کو ان کے شعری مجموعے ''چراغ زار'' پر احمد فراز ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

✦ ساہیوال ادبی فورم کے زیر اہتمام ۵ مئی کو ملک کے معروف شاعر اور مصنف راشد لاہوری کے اعزاز میں ایک شام کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شاعر، محقق اور نقاد ڈاکٹر اصغر علی بلوچ نے کی۔

✦ اُردو کے معروف شاعر اور نقاد اور صحافی فضیل جعفری ممبئی میں انتقال کر گئے۔

✦ اردو اور پنجابی کے معروف شاعر رفیق عامل کی برسی کے موقع پر بزمِ عامل کے زیر اہتمام الحمرا ادبی بیٹھک میں تقریب منعقد ہوئی۔

✦ ساہیوال آرٹس کونسل کے زیر اہتمام اوکاڑہ شہر میں یادگار محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

✦ بزمِ ادب برلن کی جانب سے پروفیسر خواجہ محمد اکرام مایہ ناز اُردو سکالر کے اعزاز میں ایک شام منائی گئی۔

✦ عمدہ ترین قلم کار اور خوب صورت شاعر ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کو گریڈ ۲۱ میں ترقی پانے پر مبارک باد۔

✦ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی لائبریری کمیٹی کے زیر اہتمام ادبی نشست و محفل غزل کا اہتمام کیا گیا۔ معروف گلوکار وحید خیال نے شعرا کا کلام پیش کیا۔

✦ ۵ مئی الحمرا آرٹس کونسل لاہور میں یونس ایمرے ترک مرکز ثقافت کی جانب سے پاکستانی اور ترک بچوں کا میلہ بعنوان ''ہم ہیں دنیا کا مستقبل'' سجایا گیا۔

✦ ٹنڈو آدم کی فضاؤں میں ایک یادگار مشاعرہ حلقۂ یارانِ سخن ٹنڈو آدم کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔

✦ لائل پور ٹی ہاؤس فیصل آباد کی جانب سے کویت سے آئے ہوئے معروف شاعر بدر سیماب کے ساتھ ایک شام منعقد کی گئی۔

✦ رائے ونڈ میں خالد محمود حسین کی کتاب کی تقریب پذیرائی منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر جواز جعفری نے کی۔

✦ یومِ مزدور محفل مشاعرہ زیر انتظام انجمن ترقی پسند مصنفین منعقد کیا گیا۔

✦ اختر رضا سلیمی کے دوسرے ناول ''جندر'' کی تقریب رونمائی نشست یونیورسٹی اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔

✦ شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد اور یونس ایمرے ترک مرکز ثقافت لاہور کے باہمی تعاون سے ایک روزہ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت ڈاکٹر علی محمد (تمغہ امتیاز) اور مہمانِ خصوصی خلیل طومار (ڈائریکٹر یونس ایمرے ترک مرکز ثقافت لاہور) تھے۔

✦ ممتاز شاعر عباس تابش کے اعزاز میں ادبی و ثقافتی تنظیم انحراف انٹرنیشنل نے ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ یہ تقریب اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔

✦ اختر شمار کا شعری مجموعہ ''عاجزانہ'' شائع ہو گیا۔

✦ بہاول نگر کے معروف اردو اور پنجابی کے شاعر سلیم نذر انتقال فرما گئے۔

✦ معروف کہانی کار انعام راجہ انتقال فرما گئے۔

✦ معروف لکھاری ربانی سعید انتقال فرما گئے۔

✦ معروف شاعر اور ٹی وی اینکر ایاز محمود ایاز (پیرس) آج کل عید کی چھٹیاں گزارنے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔

✦ ارشد نذیر ساحل (پیرس) آج کل عید کی چھٹیاں منانے پاکستان آ چکے ہیں۔

✦ پلاک کے زیر اہتمام خوبصورت نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ دو روزہ اس محفل مشاعرہ میں بہت سے شعرا نے شرکت کی اور اپنا نعتیہ کلام سنایا۔

معروف شاعر انجینئر ظفر محی الدین کا
دوسرا شعری مجموعہ
گن دا جوگی
نہایت اہتمام سے شائع ہو گیا ہے
اس شعری مجموعے کے حوالے سے
اسلم کولسری، پروفیسر عاشق رحیل، ڈاکٹر نوید شہزاد نجم الحسنین حیدر، عائشہ باسط، لیاقت گڈگور، مسعود ملہی، حسن عباسی اور ناز اوکاڑوی کی آراء شامل ہیں
صفحات: 368، قیمت: -/750
ناشر: نستعلیق مطبوعات
غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور
0300-4489310

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: صاحب (حمد)/شاعر: حسن عباسی/صفحات:128 / قیمت: 300 /رائے: نذیر قیصر
ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، فیروزسنٹرغزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور0300-4489310

فریدالدین عطار کی منطق الطیر کے قصے میں پرندے اپنے بادشاہ کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ بڑی جدو جہد کشمکش کے بعدوہ یہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ بادشاہ تو اُن کے باطن میں ہے۔حسن عباسی نے اپنے شعری سفر میں سائیں سے صاحب تک جس بادشاہ کی تلاش کی ہے وہ ان کے باطن میں پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا ہے۔آدمی جیسا خود ہوتا ہے اُس کا خدا بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔حسن عباسی نے اپنے خدا کو اپنے خوابوں کے خدوخال میں تراشا ہے۔قبائلی خداؤں سے واحد خدا کے تصور تک آدمی نے خدا کے پیکر کو ہمیشہ اپنی سہولت کے مطابق تراشا ہے۔حسن عباسی نے خوبصورت شاعری کی ہے اوراس شاعری کے باطن اور چوگرد خوبصورتی کا حاشیہ لگایا ہے۔یہی خوبصورتی کا حاشیہ سائیں اور صاحب کے گرد بھی جھلملاتا ہے۔انسانی فکر کے بنیادی سوال یہ ہیں کہ میں کیا ہوں؟ خدا کیا ہے؟اور کائنات کیا ہے؟نئی فکر اورنئی شاعری ان بنیادی سوالوں کے روایتی اوررسمی جوابوں سے مطمئن ہونے کی بجائے نئے جوابات کی جستجو میں ہے اورحسن عباسی نے صاحب میں نئے جوابات تلاش کر لیے ہیں۔صاحب کی شاعری میں خدا حاکم نہیں دوست ہے۔خدا بادشاہ نہیں بزرگ برتر اور صوفی ہے اور مولانا روم کی زبان میں خدا پیالہ نہیں پانی ہے۔اور پانی کا رنگ اور ذائقہ کس نے دریافت کیا ہے۔حسن عباسی نے خدا سے جو نیا رشتہ استوار کیا ہے اسی رشتے میں نئے انسان کی نجات ہے۔ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم مذہبی ہیں ہمیں مذہبی نہیں روحانی ہونا چاہیے۔جس طرح محبت کرنا ہی عبادت کرنا ہے اسی طرح روحانی ہوئے بغیر مذہب کے دروازے میں داخل ہونا ناممکن ہے۔حسن عباسی ایک سچے شاعر ہیں اور سچا شاعر صوفی ہوتا ہے جوزمینوں اور آسمانوں کے درمیان پرندے کی طرح سفارت کاری کرتا ہے۔حسن عباسی نے ''صاحب'' میں خدا، انسان اور کائنات کے درمیان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو نئے اسلوب اورنئی زبان سے جوڑا ہے۔حضرت داؤد رسول ہونے کے ساتھ شاعراور گائیک بھی تھے۔انہوں نے اپنے ایک زبور کی ابتدا ان لفظوں میں کی ہے''خداوند کے حضور نیا گیت گاؤ''اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا بھی پرانے گیتوں کی بجائے نیا گیت پسند کرتا ہے۔حسن عباسی کی''صاحب'' بھی خدا کے حضور ایک نیا گیت ہے جو خدا کو بھی پسند آئے گا۔

نام کتاب: بیاضِ نظر(نعت)/شاعرہ: بسمل صابری/صفحات:128 / قیمت: 600 /رائے: ابوالبیان ظہور احمد فاتح
ناشر: جمہوری پبلشرز، لاہور

بسمل صابری جنھیں اپنے دور میں مقامِ مقبولیت حاصل ہے اور جنھیں نسائی ادب کا توانا حوالہ قرار دیا جاسکتا ہے۔وہ بھی بفضلہ تعالیٰ حمد ونعت اور قصیدہ منقبت میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں جہاں انھوں نے نظم وغزل میں قابل قدر اضافے کیے ہیں اور متعدد شعری مجموعے شائقین ادب کی تواضع طبع کے لیے پیش کیے ہیں وہاں اُن کی یہ کتاب ''بیاضِ نظر'' بھی ایک دقیع اضافہ ہے جو اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ہم نے محسوس کیا ہے کہ ان کا کلام ادب واحترام اور عقیدت ومحبت سے معمور ہے۔انھوں نے جہاں اپنے خالق ورازق کے حضور نیاز مندیاں کی ہیں وہاں رسولِ مقبول ﷺ کی خدمت اقدس میں بھی گلہائے عقیدت نذر قارئین کیے ہیں۔علاوہ ازیں حضرت امام حسین علیہ السلام کے حضور سلام بھی رقم کیے ہیں۔البتہ کتاب کا بیشتر حصہ نعتیہ کلام پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے حسن کلام وبیان کے عمدہ نمونے برتے ہیں۔اُن کے ہاں

افراط وتفریط اور غلو کی فضا نہ ہونے کے برابر ہے۔ قدرت نے انھیں حفظ مراتب کا سلیقہ بخشا ہے۔ نسائی ادب میں اُن کی یہ کتاب بلاشبہ کسی سوغات سے کم نہیں ہے۔ نرم انداز اور دل آویز عقیدت ان کے سخن کا طرۂ امتیاز ہے۔

نام کتاب: توصیفِ پیمبر ﷺ (نعت) / شاعر: علی رضا خان / صفحات: 176 / قیمت: 500 / اظہار: افتخار عارف

ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 0300-4489310

اردو زبان وادب کا اعزاز وافتخار یہ بھی ہے کہ اسلامی ملکوں میں بولی جانے والی زبانوں میں سب سے کم عمر زبان ہونے کے باوجود حمد ونعت ومنقبت اور سلام ومراثی کا جیسا ذخیرہ اس میں موجود ہے کسی دوسری زبان میں نظر نہیں آتا۔ عربی اور فارسی میں عظیم المرتبت اور مقبولِ عام نعتیں لکھی گئی ہیں مگر مجموعی طور پر اردو کا دامن بے حد ثروت مند نظر آتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے شعراء نے خاص طور پر اپنے روحانی احساسات و واردات اور اپنے عقیدہ وعقیدت کو اللہ کریم اور رسول کریم الصلوٰۃ والتسلیم کی مدح وثنا کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ حالی، امیر مینائی، اقبال، محسن کاکوروی، حفیظ جالندھری اور ان کے بعد احسان دانش، ماہر القادری، اقبال عظیم، بہزاد لکھنوی، حافظ مظہر الدین مظہر، حفیظ تائب، عبدالعزیز خالد، مظفر وارثی، خالد احمد، اعجاز رحمانی، صبیح الدین رحمانی کے بعد اعلیٰ درجے کے نعت گو شعرا اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں سے اردو شاعری میں کثرت سے حمدیں اور نعتیں لکھی جارہی ہیں۔ بہت اچھی نعتیں اور کچھ بہت اچھی نہیں بھی مگر علی رضا کی نعتیں سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ سے اُن کی خالص و مخلص ارادتوں کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں اور شاعر کے زبان و بیان پر دسترس کی بھی گواہ ہیں۔ برادرِ عزیز علی رضا نے اپنے پیشِ نظر مجموعے میں فنی معیارات کے ساتھ اپنے روحانی تجربات و واردات کو نظم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق میسر آئے، جذبہ سچا ہو، توجہ راسخ ہو تو اللہ کریم شعر کو تاثیر کی نعمت سے مالا مال کر دیتے ہیں اور عوام کی طرف سے بھی اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بارگاہِ اقدس میں یہ نذرانے قبولیت کے شرف سے ہمکنار ہوں گے۔ ہمیں اس کے لیے دل سے دعا کرنی چاہیے۔

نام کتاب: کُن دا جوگی (پنجابی شاعری) / شاعر: انجینئر ظفر محی الدین / صفحات: 368 / قیمت: 750 / رائے: عائشہ باسط

ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور 0300-4489310

انجینئر ظفر محی الدین دا کلام اک زندہ سے حساس دل دی واردات اے۔ وہ اپنے آل دوالے دی بے ترتیبی نوں اپنی قلندرانہ مستی وچ اوہ گھول کیہی جاندے نیں۔ پر مینوں انج لگدا اے ایس مستی وچ اوہ سانوں ماڑیاں نوں نہیں بھلدے۔ میرا مطلب بس نکیاں نکیاں خاہشاں دے پچھے نسدی مخلوق انجینئر ظفر چاہندے نے کے اجیہا معاشرہ ترتیب دتا جاوے جتھے چنگیاں گلاں سے سوہن سلوک ہووے۔ ایہو وجہ اے کہ اونہاں دے کلام وچ پنڈ دیاں راہواں بولدیاں نیں۔ میری خوش نصیبی اے کہ میں اوہناں دی روح وچوں پھٹے شبداں نال اکھاں میل کے کجھ روحانی ہون دا چا پورا کر لینی آں۔ میری دعا اے کہ رب سوہنا اوہناں دے عشق نوں اُچے توں اُچا مقام دووے۔ تاں جے اسیں ہینے تے نمانے اوہناں دے دل دی نگھ تے محبت دی گوہڑی چھاں وچ موجاں مان دے رہئے۔ اوہناں دے شبداں نوں سن دے سنگھدے، چھیڑ دے تے چکھدے رہیے۔

نام کتاب: قدیم (شاعری) / شاعر: سیّد کامی شاہ / صفحات: 256 / قیمت: 500 / بیک فلیپ: کرشن کمار طور
ناشر: سایہ پبلی کیشنز، کراچی 0333-2267532

سیّد کامی شاہ کا شعر اُن کے ذاتی احساس کا خمیر ہے اور لفظوں کو برتنے کا ان کا اپنا ایک وطیرہ۔ یہ دونوں باتیں ان کی شاعری کے معاملات کو سمجھنے میں کار آمد تو ثابت ہوتی ہی ہیں، ان کی شعری بنیاد کی سمت کا سراغ بھی ہیں۔ ان کا شعر نہ صرف ذہن کے دریچوں کو وا کرتا ہے بلکہ ایک ایسا لائحہ عمل بھی ترتیب دیتا ہے جو ان کے شعری موضوعات کو کلیدی طور پر وا کرتا ہے اور ان کی کائناتی اور حسی جمالیات کی تشریح بھی۔ ہر شاعر کا یہ مقدر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دُہرانے کے عمل اور تقلید سے نا آشنا ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی شاعر میں یہ عمل تدریجی تواتر کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے اور کسی کے ہاں غیر ارادی طور پر نامحسوسات کے دائرۂ اختیار میں۔ مجھے خوشی ہے کہ سیّد کامی شاہ نے اپنے آپ کو اس سے بچانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ وہ اپنی اس سعی میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں یہ میں ان کے قارئین پر چھوڑتا ہوں، لیکن یہ بات میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پرت در پرت کھلنے والا ان کا شعر آپ کو اپنی گرفت میں لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کا تخلیقی عمل ان کے لیے تو باعث توقیر ہے ہی، ہمارے لیے بھی قلبی اطمینان کا مخزن ہے۔ ان کا لب و لہجہ بھی ان کے شعر سے بے حد مطابقت رکھتا ہے اور خصوصیات کا حامل ہے۔

نام کتاب: سبب تمہی ہو (شاعری) / شاعر: ہمایوں پرویز شاہد / صفحات: 160 / قیمت: 500 / رائے: حسن عباسی
ناشر: گلشن ادب پبلی کیشنز، آؤٹ فال روڈ لاہور

انتظار حسین نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ پرندے کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی ہمیں ماضی کی خبر دیتی ہے۔ وہ گزرے ہوئے زمانوں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہمایوں پرویز شاہد کی شاعری میں بھی مجھے وہی آواز سنائی دیتی ہے کہیں دور سے آتی ہوئی، ماضی کے جھروکوں سے ہمیں بیدار کرتی ہوئی۔ اُس کی شاعری میں سادگی، شگفتگی اور بے ساختگی ہے۔ وہ زندگی کا گہرا تجربہ اور شعور رکھتا ہے۔ "سبب تمہی ہو" کی شاعری اس کا مظہر ہے۔ ہمایوں پرویز شاہد کی شاعری اور شخصیت میں دوئی نہیں ہے۔ وہ جیسا خود ہے ویسی ہی اُس کی شاعری ہے۔ دل پذیر انداز میں ہم سے بات کرتی ہوئی مکمل سچائی کے ساتھ ہم کلام۔ وہ جن حالات سے گزر رہا ہوتا ہے ان احساسات و جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اُس کی شاعری پر آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔ اُمید ہے "ضمیر کا قرض" کے بعد اُن کا تازہ اُردو شعری مجموعہ بھی ادبی اور عوامی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گا۔

نام کتاب: ایک دریا ہے میری آنکھوں میں (شاعری) / شاعر: اعظم سہیل ہارون / صفحات: 144 / قیمت: 400 / رائے: محمد امین ساجد سعیدی
ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

اعظم سہیل ہارون غزل مزاج دوست ہے۔ اساتذہ فن کے نقش قدم پہ اعظم سہیل ہارون کو جدت آمیزی کے زینے پر کھڑا پایا، اگر ان کی مشق سخن جاری رہی اور شاعری کے زینے پہ چلتا رہا تو یقیناً اعظم ہی نظر آئے گا اس وقت مجھے اعظم سہیل ہارون کی شاعری کو فنی حوالے سے دیکھ کر چند سطور کی ترقیم کرنی ہے۔ گو کہ یہ الفاظ کو شائستگی اور برجستگی سے یوں استعمال کرتے ہوئے صنعت تحت النقاط یعنی صنعت تحتانیہ میں طبع آزمائی کرتے ہیں

نامہ ہائے احباب

محترم حسن عباسی صاحب!
السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ معہ اہل خانہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ''ارژنگ'' مل گیا۔ کرم فرمائی کا بہت بہت شکریہ!!
ایک غزل برائے ''ارژنگ'' ارسالِ خدمت ہے۔ والسلام

نصرت صدیقی
فیصل آباد

عزیزم عامر بن علی صاحب!
السلام علیکم۔ آپ کا رسالہ 'ارژنگ' ملا۔ حسب معمول مطالعہ شروع کیا۔ اچانک حضورؐ کی نعت جو راقم کے عقیدت کے پھول تھے نظر سے گزری۔ بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے اس پاک کلام سے اپنے ماہوار رسالے کو تزئین بخشی اور راقم کو شکریے کا موقعہ فراہم کیا۔
اب دوسوال سپردِ قلم کر رہا ہوں:
(۱) ارژنگ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟
(۲) حضرت بوعلی قلندر کون تھے ان کے متعلق نیٹ سے یا کسی اور ذریعے سے معلومات ملیں تو اپنے رسالے کی زینت بنائیں۔ شکریہ
''قلندر کی صدا'' سے یہ سوال اُبھرا ہے۔
عزیزم اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام مزین بھی ہے۔ زینت و تزئین کی لفظیں راقم نے استعمال کی ہیں۔ گویا ہم سنت الٰہ پر عمل پیرا ہیں۔ آئندہ اصلی رفاقت و محبت کے ساتھ ساتھ قلمی دوستی بھی چلتی رہے گی آپ کے معیاری رسالے سے رابطہ بحال رہے گا۔ ان شاءاللہ
پرسانِ حال کو سلام آپ کے رسالے کے تمام منسلک احباب کو سلام۔

شفقت حسین نقوی
میاں چنوں ضلع خانیوال

برادرم حسن عباسی صاحب!
سلام مسنون! مزاج عالی؟
ارژنگ کا تازہ شمارہ ملا۔ گویا ہدہد کی زبانی گلشن سبا سے مژدہ جاں فزا آیا۔ کیسے کیسے لوگوں کی آپ نے کہکشاں ترتیب دی ہے۔ یہ آپ کے مسلسل کام اور نیک نیتی کا ثمر ہے۔ آپ میں مجھے صوفیہ کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ جن کی مجالست میں اچھے کیا برے لوگ بھی موجود ہوتے تھے۔ میں آج کل گھر پہ ہی مقید ہوں۔ لکھنے پڑھنے کا کام جاری ہے۔ گویا چکی کی مشقت کے ساتھ فکرِ سخن بھی جاری ہے۔
آپ کیسے ہیں؟ آپ کا اور ڈاکٹر فرزانہ کوکب صاحبہ کا بے حد شکریہ، میری نظم پر انھوں نے چند صفحے لکھے اور آپ نے انھیں اس معتبر جریدے میں جگہ دی۔
اب اس بات پر آپ کے لیے بہت سی نیک خواہشات

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع
ساہی وال

پیارے حسن عباسی صاحب!
السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح معیاری دل کش شاندار اور ادبی تخلیقات سے مزین شمارے نے تھکن اُتار دی ہے۔ آپ کا بے حد سپاس گزار ہوں کہ آپ نے ہمیشہ مجھے نمایاں جگہ عطا کی ہے۔
ایک تازہ غزل ارسال خدمت ہے معہ اپنے عزیز رضا جعفری اور فیصل کاشمیری کی بھی غزل حاضر ہے۔ شامل اشاعت فرما کر مرحمت فرمادیں۔

اسد اعوان

مئی کا شمارہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ!!
''ارژنگ'' مسلسل مل رہا ہے۔ آپ کے اس ادبی کام کو ادبی دُنیا میں سراہا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید استقامت دے۔ گزشتہ دنوں گوجرہ میں ''کل پاکستان قرآنی خطاطی نمائش'' کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک بھر سے کیلی گرافر بھی گوجرہ تشریف لائے۔ اس حوالے سے ایک مضمون اور گوشے کے لیے شاعری پیش خدمت ہے۔ کسی قریبی اشاعت میں شامل کریں۔ دیگر سٹاف کو سلام۔

غزالی
گوجرہ

قابل احترام جناب مدیر حسن عباسی صاحب!
السلام علیکم۔ گلہائے عقیدت! اللہ شاد رکھے۔ تعلق ادب سے ہے زندگی کی 28 بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ کتابوں اور رسالوں نے آکسیجن دے رکھی ہے۔ اب حال یہ ہے کہ اندھے جہاں میں اندھے ہیں راستے جائیں تو جائیں کہاں!
محترم عامر بن علی کو آداب! ان کے بارے میں ایک شعر یاد آ گیا۔

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

اگر آپ اس قابل سمجھیں تو کوئی شمارہ ارژنگ کا جس میں آپ کا عکس حسن شامل ہوا رسال فرمائیے گا یہ میرے لیے اعزاز ہوگا۔ اللہ شاد آباد رکھے۔ امن کے رستے ہوں اور پھول برستے ہوں آمین

سید شاہ عالم زمرد

آج کا شاعر اور ادیب اپنی نگارشات کے ذریعے
معاشرتی ناانصافیوں اور سماج کے مسائل کا اصلی چہرہ پیش کر رہا ہے

پاکستان میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن کا نعم البدل باہر کے ممالک میں نہیں ملتا

کینیڈا میں مقیم نامور شاعرہ

تبسم انوار

سے لبنیٰ صفدر کی گفتگو

ارژنگ: اپنے بارے میں مختصر بتائیے

• اسلام علیکم۔لبنیٰ صفدر سب سے پہلے تو میں آپ کا اور ماہنامہ ارژنگ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ نے آج کے انٹرویو کے لیے میرا انتخاب کیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے از حد مسرت ہو رہی ہے کہ ماہنامہ ارژنگ ادبی حلقوں میں اپنی ایک منفرد پہچان بنا چکا ہے اور میری دعا ہے کہ اسے آنے والے دنوں میں مزید کامیابیاں عطا ہوں۔

میرا پورا نام تبسم انوار ہے۔ میں ادبی نام کے طور پر بھی یہی نام استعمال کرتی ہوں۔ تخلص ''تبسم'' ہے۔ پیدائش کراچی میں ہوئی اور وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ شادی کے چند سال بعد ہماری فیملی کینیڈا اسیٹل ہو گئی۔ تقریباً بائیس سال سے کینیڈا کے شہر مانٹریال میں مقیم ہوں۔

ارژنگ: آپ کی ادبی اور غیر ادبی کیا مصروفیات ہیں؟

• جب بچے ذرا سمجھدار ہو گئے تو میں نے اپنے شوق یعنی شاعری کی آبیاری شروع کی اور 2006 سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ میں مقامی اخبار میں ایک کالم ''آ گہی کے دریچے'' کے نام سے لکھتی رہی ہوں اور مقامی ٹی وی چینل میں ''ہیلو کینیڈا'' کے نام سے ایک ٹاک شو بھی کرتی رہی۔ علاوہ ازیں کئی اسٹیج پروگرامز کی میزبانی کی۔ مقامی ادبی تنظیموں کا حصہ رہی اور بالآخر 2013ء میں کاروانِ ادب مانٹریال کی بنیاد رکھی جو کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے معیاری ادبی پروگرامز اور کامیاب مشاعروں کے انعقاد کے حوالے سے اپنی ایک پہچان بنا چکا ہے۔

ارژنگ: پاکستان اور غیر ملک میں رہنے میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

• پاکستان اور بیرونِ ملک رہنے میں جس فرق کے بارے میں آپ نے سوال پوچھا ہے تو اس کے بارے میں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ آپ چاہے ساری زندگی بیرونِ ملک گزار لیں لیکن آپ کے دل سے پاکستان کی محبت کبھی کم نہیں ہوتی۔ شہریت چاہے کسی بھی ملک کی اپنا لیں لیکن دل پاکستانی ہی رہتا ہے۔ آج بھی میں خود کو کراچی کے ہی گلی کوچوں میں محسوس کرتی ہوں۔ اس مٹی کی مہک آج بھی میرے احساسات کو معطر رکھتی ہے۔

ایک بنیادی فرق جو میں محسوس کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ یہاں اظہارِ رائے کی آزادی ہے۔ قانون کی بالادستی ہے، تعلیم اور روزگار کے مواقع سب کو یکساں میسر ہیں۔ میری دعا ہے کہ کاش یہ ساری سہولیات میرے وطن کے غریب عوام کو بھی میسر ہوں۔

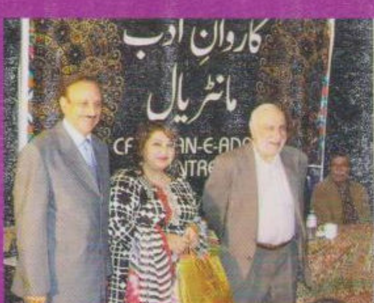

آج بھی خود کو کراچی کے گلی کوچوں میں محسوس کرتی ہوں

(بقیہ اندرونی صفحات پر)

نامور ادیب، معروف شاعر اور معروف کالم نگار عامر بن علی کی کتب کے

دیدہ زیب اور اعلیٰ معیار کے

تازہ ایڈیشن

شائع ہو کر پاکستان کے تمام اہم کتب خانوں پر دستیاب ہیں

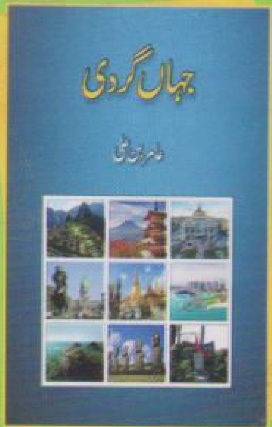

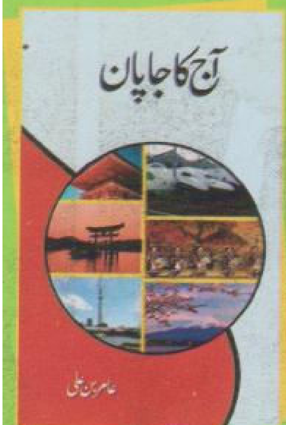

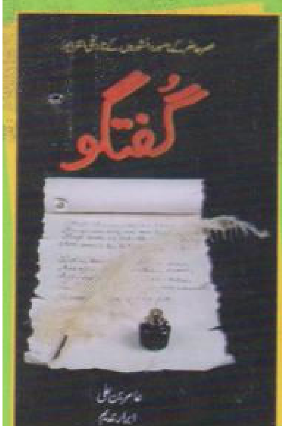

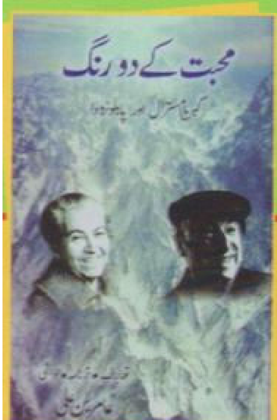

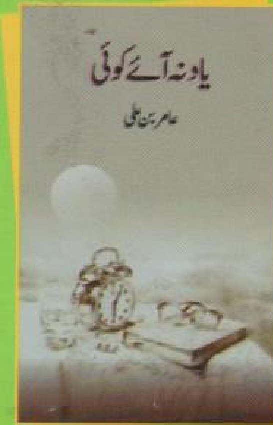

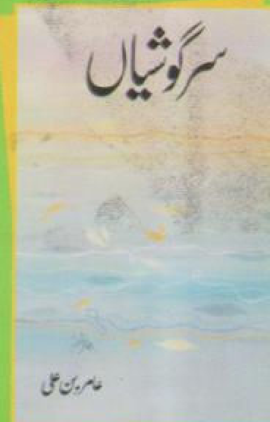

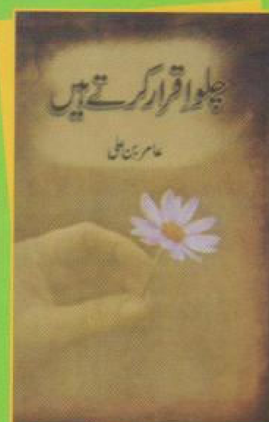

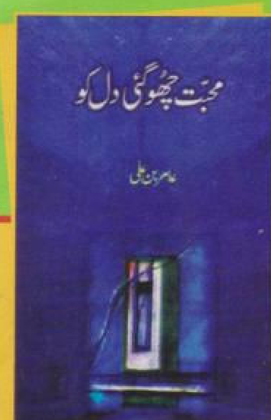

Amir Bin Ali is one of the finest Poets from younger generation that have emerged during last decade.
(Express Tribune Book Review)

Staying away from his homeland makes Amir Bin Ali skeptical that he might get disconnected from his past, it is evident from his poetry and prose that he loves his country a lot and want to stay connected. He is successfully doing so through his writings.
(Daily The Nation Book Review)

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com

Design By: 0300-4529821 MUHAMMAD AHSUN Gull

رزلٹ لسٹ جنرل الیکشن2018

PS	نام پولنگ اسٹیشن	رانابابرحسین	جمشید شوکت	رانایوسف	کمی	لیڈ
1	گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج تلمبہ روڈ (فرسٹ حصہ)	297	332	7	35	
2	گورنمنٹ مڈل سنٹرا سکول (مڈل بلاک)	328	507	2	179	
3	گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج تلمبہ روڈ (سیکنڈ حصہ)	305	367	1	62	
4	گورنمنٹ گرلز مڈل سنٹرا سکول (مڈل حصہ) میاں چنوں	358	319	4		39
5	ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر فیصل ٹاؤن	358	480	3	122	
6	گورنمنٹ بوائز ماڈل ہائی اسکول (مشرقی بلاک)	301	320	7	19	
7	گورنمنٹ بوائز ماڈل ہائی اسکول (مشرقی بلاک)	283	322	4	39	
8	گورنمنٹ گرلز ماڈل ہائی اسکول (مشرقی بلاک)	290	218	1		72
9	گورنمنٹ بوائز نمبر 4 مڈل سکول	328	293	7		35
10	گورنمنٹ بوائز ماڈل ہائی اسکول (مین بلڈنگ)	328	372	10	44	
11	گورنمنٹ گرلز ایم سی مڈل سنٹر سکول	232	272	8	40	
12	گورنمنٹ گرلز پرائمری اسکول لطیف باغ صادق کالونی	623	464	36		159
13	گرنمنٹ گرلز پرائمری سکول چک نمبر 125/15-L باغ والی	451	305	28		146
14	گورنمنٹ معین الاسلام ہائی اسکول میاں چنوں	369	333	25		36
15	گورنمنٹ معین الاسلام ہائی اسکول میاں چنوں	257	257	18		00
16	گورنمنٹ ایم سی گرلز مڈل سکول ریلوے کالونی	197	198	5	1	
17	گورنمنٹ ایم سی گرلز مڈل سکول ریلوے کالونی	272	287	19	15	
18	گورنمنٹ معین الاسلام ہائی اسکول (سائنس بلاک)	442	368	27		74
19	گورنمنٹ معین الاسلام ہائی اسکول (Q بلاک)	788	426	32		362
20	گورنمنٹ معین الاسلام ہائی اسکول (مین بلڈنگ)	310	258	5		52
21	گورنمنٹ ایم سی گرلز مڈل اسکول عیدگاہ (مڈل حصہ)	442	196	15		246
22	گورنمنٹ ایم سی گرلز مڈل اسکول عیدگاہ (مڈل حصہ)	122	81	7		14
23	دفتر گورنمنٹ فوڈ گرین بودلہ روڈ میاں چنوں	739	503	32		236
24	گورنمنٹ ایم سی پرائمری اسکول نمبر 5 چپ شاہ مہر آباد روڈ	501	343	11		158
25	دفتر مارکیٹ کمیٹی غلہ منڈی میاں چنوں M-2	221	154	6		67
26	گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سعود آباد (نیا حصہ نمبر 1)	536	344	27		192
27	گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سعود آباد (نیا حصہ نمبر 1) (مڈل حصہ)	408	266	12		142
28	گورنمنٹ ایم سی بوائز پرائمری سکول سعود آباد (پرانا حصہ نمبر 2	356	220	23		136
29	گورنمنٹ ایم سی بوائز پرائمری سکول سعود آباد (پرانا حصہ نمبر 2	273	176	11		97
30	گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سعود آباد (نیا حصہ نمبر 1) (ہائی حصہ)	396	262	14		134
31	ورکرز ویلفئر گرلز ہائی سکول لیبر کالونی میاں چنوں (مڈل حصہ)	264	276	12	12	
32	ورکرز ویلفئر گرلز ہائی سکول لیبر کالونی میاں چنوں (مشرقی حصہ)	506	370	40		136
33	ورکرز ویلفئر گرلز ہائی سکول لیبر کالونی میاں چنوں	333	230	32		103